اکتوبر ۲۰۲۳ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۴ شمارہ : ۱۰

اکتوبر ۲۰۲۳ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.in

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز		ابراراحمد خان	۳
مقالات	صوفیانہ شاعری کے سرخیل: خواجہ بندہ نواز گیسودراز		ڈاکٹر مختار علی	۴
	سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری: چند نکات		ظہیر محمد	۸
	غالبؔ کی فارسی رباعیوں کا مستقبل		محمد مستقیم	۱۰
	مجروحؔ کی شاعری میں سیاسی اور انقلابی رمزیت		رئیس الدین رئیسؔ	۱۳
	شمیمؔ قاسمی کی غزل گوئی کا اختصاص		ڈاکٹر امام اعظم	۱۶
	غزل کا مزاج داں: نیرؔ قریشی گنگوہی		پروفیسر عرفان آصف	۲۰
	مظفر حنفی کے افسانوں کی جہتیں		پروفیسر شہزادی	۲۴
	باپو: اردو شعر وادب میں		ڈاکٹر نشاط اختر	۲۹
	منفرد لہجے کا شاعر: فراقؔ گورکھپوری		منظر ریونڈھوی	۳۳
	قمر رئیس کی ناول فہمی: خواتین کرداروں کی روشنی میں		جمیلہ بی بی	۳۵
افسانے	فَبِاَیِّ آلاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ		پروفیسر اسلم جمشید پوری	۳۸
	سادگی میں سمادھان		ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری	۴۱
	تین مشت خاک		سلیم سرفراز	۴۳
	گناہوں کا کفارہ		افتخار عظیم چاند	۴۸
منظومات	نعت پاک		جوہرؔ نوری	۵۱
	خاموشی		ڈاکٹر ریشاؔ قمر	۵۲
	کوئل کی پرسوز آواز قبرستان میں		شمس الرحمٰن / نسیم عزیزی	۵۳
	غزلیں		اسدؔ رضوی	۵۴
	غزلیں		شہاب ظفرؔ اعظمی	۵۵
	غزلیں		وارثؔ رفیع	۵۶
	غزلیں		طلحہ تابش	۵۷
	غزلیں		ڈاکٹر محمد ضمیر رضاؔ / جبیںؔ نازاں	۵۸
	غزلیں		سلطان مظفرؔ آزاد	۵۹
	رباعیات		خالد عبادی	۶۰
کتابوں کی دنیا	نہایت	خالدؔ عبادی	مبصر : علی احمد فاطمی	۶۱
	مئو: شہر ہنروراں	ڈاکٹر شکیل احمد	مبصر : ڈاکٹر رفیق احمد	۶۴
	انتخاب رباعیاتِ عابدہؔ شیخ	عابدہؔ شیخ	مبصر : شرف الہدیٰ	۶۶
سلام و پیام	شکیلؔ سہسرامی، ڈاکٹر شائستہ خاتون، صائمہ پرویز، وارثؔ ریاضی، زویا شاہین			۷۰

بچوں کا زبان وادب : ۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ادا ریہ

حرف آغاز

شکر مالک کائنات کا ـــــ ’’زبان وادب‘‘ کی تازہ اشاعت آپ کے ہمدست ہورہی ہے۔ اس شمارے کے افتتاحی مقالوں میں مناسب تمہیدات، مستند حوالہ جات، تاریخی وسوانحی اشارات اور شعری وتنقیدی اقتباسات کے ساتھ ’’صوفیانہ شاعری کے سرخیل: خواجہ بندہ نواز گیسودراز‘‘ اور حکمراں شاعر محمد قلی قطب شاہ معانؔی کی اولیات ومزیاتِ سخن کا جامع تذکرہ ہوا ہے۔ بعدازیں خاص انداز سے سائنسی توجیہات ونفسیاتی ایمائیات کے ساتھ کہیں ’’غالبؔ کی فارسی رباعیوں کا مستقبل‘‘ دکھایا گیا ہے، کہیں عہد وشخصیت کے بعض پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ’’مجروحؔ کی شاعری میں سیاسی اور انقلابی رمزیت‘‘ آشکار کی گئی ہے، کہیں تنقیدی وتجزیاتی شذرات اور حسب موضوع اشعار کے ساتھ نیرؔ قریشی گنگوہی کو غزل کے مزاج داں فن کار کی حیثیت سے سامنے لایا گیا ہے، کہیں شمیمؔ قاسمی کی غزل گوئی کے اختصاص پر نظر ڈالی گئی ہے اور کہیں غزل کے حوالے سے آہنگ فراقؔ کی خصوصیات پر گفتگو ہوئی ہے۔ مزید برآں اس حصہ میں کہیں ادبی تحریک ورجحان کے اثرات کی یادوں کے ساتھ عملی تجزیاتی طریقہ سے ’’مظفر حنفی کے افسانوں کی جہتیں‘‘ منور کی گئی ہیں، کہیں اردو ناولوں کو تین ارتقائی ادوار میں رکھ کر، خواتین کرداروں کی پیش کش کے منظر وپس منظر میں ڈاکٹر قمر رئیس کی ناول فہمی کا موضوع مبرہن کیا گیا ہے اور کہیں عظیم المرتبت رہنما مہاتما گاندھی کی جینتی کے اس مہینہ کی مناسبت سے ’’باپو: اردو شعروادب میں‘‘ دکھائے گئے ہیں۔

اس شمارے کے ’’افسانے‘‘ کی شروعات اُس کہانی سے ہورہی ہے جو آیت کریمہ ’’فِبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ‘‘ کے عنوان سے شرف یافتہ ہے۔ بظاہر یہ ایک مجذوب کی کرامتوں کی کہانی ہے، لیکن بہرنوع یہ قرآنیاتی غذا سے مالا مال ہے اور اس میں نہ صرف متعلقہ علاقہ کے مناظر ملتے ہیں بلکہ اس میں پلاٹ کو عصری احوال کی عکاسی سے جوڑنے کا ہنر بھی روشن ہے، جب کہ زمینی حقیقت سے جڑی ہوئی موثر کہانی ’’سادگی میں سمادھان‘‘ مقامی تہواروں کے حوالہ سے غریب ومحنت کش دیہی باشندوں کی سادہ لوحی، حقیقت پسندی اور قناعت پسندی دکھاتے ہوئے ہمیں ایک خاموش مگر واضح ذہن ساز پیغام دے جاتی ہے، پھر ایک طرف اگر فطری یادوں کے ساتھ کہانی ’’تین مشت خاک‘‘ اپنی ایمائی بنت اور کامیاب نفسیاتی کلائمکس میں وحدت تاثر کا ہنر دکھاتی ہے تو دوسری طرف غیر محفوظ سفر کے ماحول کا پس منظر لئے ہوئے نفسیاتی کہانی ’’گناہوں کا کفارہ‘‘ بھی اپنے چونکا دینے والے انجام کے ساتھ یہ منظر دکھا جاتی ہے کہ جب انسان کا احساس باطن دفعتاً جاگ اُٹھتا ہے تو پھر ندامت اُسے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

ہمیں امید واثق ہے کہ مقالوں اور افسانوں کے دوش بدوش نعت ونظم اور غزلیات ورباعیات پر مشتمل اس شمارے کا منظوماتی حصہ بھی جالب توجہ ہوگا، ’’کتابوں کی دنیا‘‘ بھی پرکشش نظر آئے گی اور ’’بچوں کا زبان وادب‘‘ بھی، جو دیگر نگارشات کے ساتھ اس مہینہ میں پیدا ہونے والے رہنماؤں یعنی لال بہادر شاستری اور اے پی جے عبدالکلام پر مضامین سے آراستہ ہے، انہیں خاص طور سے پسند آئے گا۔ انہیں کلمات کے ساتھ آپ کے حوصلہ افزا خطوط کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خداحافظ، خدا ناصر!

ابراد احمد خان

(ابرار احمد خان)

مقالات

ڈاکٹر مختار علی
Assistant Professor, Deptt. of Urdu, Govt. Arts College,
Seekar, Rajasthan (Mob. 9509180123)

صوفیانہ شاعری کے سرخیل: خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

ہندوستان کی محبوب زبان اردو میں ادب کا نقش اوّل بلا تفریق واختلاف حضرت امیر خسرو (۱۳۲۴ء۔۱۲۵۳ء) کے اس شعری تجربے کو تسلیم کیا جاتا ہے جو ان کی غزلوں، کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں کی شکل میں عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کے حسین امتزاج سے وجود میں آیا۔ یہ اردو کے آغاز کی طرف خسرو کی معرفت کا پہلا قدم تھا، اس نئے شعری تجربے نے باقاعدہ روایت کی شکل تو اختیار نہیں کی، لیکن آگے چل کر یہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں رہنما مینار ضرور ثابت ہوا۔

امیر خسرو کے بعد پوری ایک صدی کا خلا ہے جس میں اردو نثر و نظم کا کوئی نمونہ ایسا نظر نہیں آتا جو اردو کی تاریخ کا حصہ بننے کی اہلیت رکھتا ہو، حالاں کہ ایسا نہیں کہ اردو نثر و نظم پر کسی نے توجہ نہیں کی، لیکن بہر کیف یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ امیر خسرو سے لے کر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (ولادت ۴/رجب ۷۲۰ھ/۷/اگست ۱۳۲۱ء، وفات ۱۶/ذی قعدہ ۸۲۵ھ/۱۰نومبر ۱۴۲۲ء) تک جن اکابر صوفیا نے عوام کی تعلیم و تلقین اور تبلیغ دین کا کام کیا، وہ اپنی زبانی تعلیمات کو سپردِ قلم نہ کر سکے۔ غالباً اس کی وجہ اکابر صوفیا میں اخلاص وللّٰہیت کے اس جذبہ کا خاص غلبہ تھا، صاحب ''آب کوثر'' کے لفظوں میں واقعی:

> ''ہندوستان کی مذہبی زندگی کا یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ جن ہستیوں نے ہماری ابتدائی مذہبی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا، مثلاً حضرت خواجہ اجمیری، شیخ زکریا ملتانی، بابا فرید، حضرت سلطان المشائخ، حضرت مخدوم جہانیاں، حضرت چراغ دہلوی، انہوں نے اپنے خیالات تفصیل اور وضاحت سے صفحۂ کاغذ پر ضبط نہ کیے۔'' (آبِ کوثر، شیخ محمد اکرام، فرید بک ڈپو، دہلی، ص ۳۷۰)

حضرت امیر خسرو کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں دوسرا اہم نام حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا ہے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ پچھلی ایک صدی کے خلا کی تلافی کی بلکہ اردو زبان کی گاڑی کو اس پٹری پہ ڈال دیا جس پر یہ زبان منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے ہندوستان میں ایک شاندار ادبی تاریخ رقم کر سکی۔ بقول شیخ اکرام:

> ''حضرت گیسو دراز کے زمانے میں یہ حجاب کسی قدر دور ہوا۔'' (آبِ کوثر، ص ۳۷۰)

اس اعتبار سے خسرو کے بعد خواجہ بندہ نواز اردو ادب کی تاریخ میں دوسرے سب سے اہم انسان ہیں۔ سیّد احتشام حسین بابا فرید گنج شکر سے شاہ ہاشم علوی تک، بزرگ صوفیا کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''ان ناموں میں امیر خسرو اور حضرت خواجہ گیسو دراز، اردو کی ادبی تاریخ کی نگاہ سے اہم ہیں۔'' (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۱۹۹۹ء، ص ۹)

یہ زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں تبادلہ دار السلطنت کی وجہ سے بڑی اہمیت کا زمانہ تھا، جب محمد بن تغلق نے دہلی کے بجائے دیوگیری (دکن) کو دولت آباد کا نام دے کر اپنا پایۂ تخت بنایا اور نہ صرف پایۂ تخت بنایا بلکہ سرکاری فرمان کے تحت دہلی کی تقریباً تمام آبادی کو بھی وہاں منتقل کر دیا۔ اگرچہ محض سال بھر بعد اس نے اپنے فیصلے میں نرمی برتتے ہوئے عوام کو

واپس دہلی لوٹنے کی اجازت دے دی، بہت سے لوگ واپس وطن لوٹے، مگر بہت سے لوگوں نے دکن ہی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ اگرچہ اس واقعہ سے ہندوستان کی سیاست میں کوئی

بارآور نتیجہ نہ نکلا، لیکن یہ بڑے پیمانے پر کی گئی ہجرت اردو زبان وادب کے بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

عوام کے ساتھ بہت سے علما اور صوفیا نے بھی دکن کا رُخ کیا اور اپنی تبلیغی و تعلیمی سرگرمیوں کو دکن میں بحسن وخوبی انجام دیا۔ ہجرت کرنے والے صوفیائے کرام میں بندہ نواز گیسو دراز کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے عوام میں مقامی بولیوں اور عربی فارسی کے معروف الفاظ وتراکیب سے ملی جلی سہل زبان میں نہ صرف درس وتدریس کا چرچا عام کیا بلکہ عربی فارسی کو چھوڑ کر عوامی زبان میں جسے ہم قدیم ہندی کہہ سکتے ہیں تصنیف وتالیف کے کارِہائے نمایاں بھی انجام دیا۔ آپ کا یہ اقدام اردو ادب کی تاریخ میں عہد ساز ثابت ہوا۔ آپ نے ایک طرف اپنے پیر ومرشد سے حاصل شدہ علوم ومعرفت کے چشموں سے پیاسی روحوں کی سیرابی کا کام لیا تو دوسری طرف علومِ ظاہری کی تدریس و تدوین میں بھی خاصا انہماک دکھایا۔ شیخ اکرام رقم طراز ہیں کہ:

''حضرت گیسو دراز کا جس طرح تصوف اور عرفان کی منزل میں اونچا درجہ ہے اسی طرح علم وفضل اور تصنیف و تالیف کی تاریخ میں بھی ان کا نام روشن ہے۔''

(آبِ کوثر، ص ۲۷۰)

حضرت گیسودراز کے درس وتدریس کے معمولات پر روشنی ڈالتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''حضرت صاحب علم وفضل اور صاحب تصانیف بھی ہیں۔ آپ کا معمول تھا کہ نمازِ ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث اور تصوف وسلوک کا درس دیا کرتے تھے اور گاہے گاہے درس میں کلام وفقہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی، جو لوگ عربی و فارسی سے واقف نہ تھے ان کے سمجھانے کے لیے ہندی زبان میں تقریر فرماتے تھے۔''

(اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبدالحق، انجمن اردو ہند، اردو گھر، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۵)

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو شمال ودکن کے تمام علما وصوفیا میں اردو کی ترویج واشاعت کے اعتبار سے اوّلیت حاصل ہے۔ خصوصاً دکن کی تقریباً چار سو سالہ اردو ادب کی شاندار تاریخ آپ ہی کے فیض کرم کی مرہونِ منت ہے۔

حضرت گیسودراز کے سفر دکن اور یہاں قیام کا زمانہ اردو کے سفر دکن کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اس دوران اردو نے ایک بولی سے زبان اور ادب کی طرف جست کی۔ جناب احمد لکھتے ہیں:

''حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی دکن تشریف آوری سے دکن میں دکنی اردو کی تحریری تخم ریزی ہوئی۔''

(اردو زبان کی ترویج واشاعت میں صوفیائے دکن کا حصہ، مشمولہ ماہنامہ ''اردو دنیا'' بابت فروری ۲۰۲۲ء)

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ قیامِ دہلی کے دوران آپ سے منسوب قدیم ہندی یا اردو کا کوئی تحریری نمونہ دستیاب نہیں، تاہم دکن میں آنے کے بعد عربی فارسی رسائل کے ساتھ اردو نثر وشعر میں بھی آپ کی تخلیقات ملتی ہیں۔ بقول شیخ اکرام:

''حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی زیادہ تصانیف فارسی میں ہیں، لیکن دکن میں آمد کے بعد آپ نے عوام کی تلقین کے لیے بعض رسالے دکنی زبان میں بھی لکھے۔''

(آبِ کوثر، ص ۳۷۲)

آپ کی دیگر تصانیف میں ''چکی نامہ'' اور ''ہدایت نامہ''، ''شکار نامہ''، ''رسالہ تلاوت الوجود''، ''تمثیل نامہ'' اور رسالہ ''سہ بارہ ہشت مسائل'' کے نام بھی آتے ہیں یہ سب رسالے علم تصوف میں لکھے گئے ہیں، لیکن ان باقیات کو حضرت کی طرف منسوب کرنے میں بہرحال تحقیقی لحاظ سے احتیاط کا طریقہ نظر انداز نہیں ہوسکتا ہے۔

خواجہ بندہ نواز کے نثری کارناموں کے علاوہ ایک بڑا کارنامہ اردو شاعری کی سمت ورفتار متعین کرنا بھی ہے۔ آپ کا دیوان شیخ اکرام کے مطابق مولوی سیّد عطا حسین کی تصحیح کے بعد شائع ہوگیا ہے۔

حضرت بندہ نواز کے دستیاب کلام کی روشنی میں اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جن میں عاشقانہ وعارفانہ جذبات کا اظہار دلوں کو زندگی دیتا ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو خسرو کے بعد یہ اہمیت

حاصل ہے کہ انہوں نے مختلف راگ راگنیوں کو بھی نظم کیا ہے جس سے ہندوستانی رنگ آپ کی شاعری کا خاص وصف بن جاتا ہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی زبان قدیم اردو دکنی ہے جس پر کھڑی بولی کے اثرات بھی نمایاں طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کی نثر و شاعری کے موضوعات عارفانہ و عاشقانہ ہونے کے علاوہ قدیم ہندی فلسفوں سے بھی متاثر نظر آتے ہیں: خصوصاً ''سگن'' اور ''نرگن'' نظریات جن کو آپ نے اپنے تبلیغی مشن کے اعتبار سے اسلامی انداز اور صوفیانہ زبان و بیان میں پیش کیا ہے۔ آپ ''شہباز'' تخلص فرماتے تھے، کہیں کہیں محمد حسینی بھی مندرج ہے۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز نے اپنی شاعری کے ذریعہ تصوف کی جن تعلیمات کو عام کیا ان میں عشق حقیقی اور پند و نصائح کے ساتھ تربیت نفس پر آپ نے خصوصی توجہ فرمائی ہے۔

انسان کی ظاہری و باطنی فلاح و بہبود کے لیے نفس کی سرکشی کو قابو میں کر کے اسے مثبت اقدار کے تابع کرنا دین و دنیا کے ارتقا کی تمام منازل میں پہلی منزل ہے، چنانچہ تربیت نفس کے حوالے سے آپ کی ایک غزل ادبی حلقوں میں ہمیشہ سے قابل توجہ رہی ہے جسے مولوی عبدالحق نے ''اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' اور نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں نقل کیا ہے۔

اس مسلسل غزل میں انسان کو زندگی کے میدان کا سپاہی اور ایک سرکش گھوڑے کو نفس امارہ کا استعارہ بنا کر سالکین کی رہنمائی کی گئی ہے کہ جس طرح گھوڑا جب سپاہی کے قابو میں نہیں ہوتا تو اسے کہیں بھی گرا سکتا اور منزلِ مقصود سے محروم کر سکتا ہے اور اگر قابو میں رہے تو اسے منزل مقصود تک بعافیت تمام پہنچا سکتا ہے، بالکل اسی طرح نفس انسانی کا معاملہ ہے کہ جب انسان اس کی امارگی کو قابو میں نہیں رکھ پاتا تو یہ انسان کو دنیا و آخرت میں رسوا و ناکام بنا دیتا ہے، لیکن جب انسان اس کی امارگی کو قابو کر کے اسے مطمئنہ کی لگام پہنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہی نفس اس کو اس کی حقیقی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے دیگر صوفیا کی طرح نفس کی مذمت و مخالفت کی بجائے تربیت نفس پر توجہ دی ۔

توں تو سہی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
نا ہو نرم تج او چری پس پاوے گا
گوڑے کوں تھبر کھوڑھے بدخیال اس کا ہور ہے
تن لوٹنے کا جوڑ ہے نا چھور اس بدٹھارتوں
دے کلا دل گیان کا چار اکھلا ایمان کا
انعام دے خوش دھیان کا رکھ باند اپنے دارتوں
گھوڑے کوں بہیتر گھوڑ ہے اس کوں نہ حکمت ہور ہے
ہر دم ذکر سوں توڑ ہے غافل نئیں ہشیارتوں
خو گیر شریعت نعل بند زین ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت پیش بند ٹك معرفت اختیار توں
دونوں رکاباں نیك بد رکھنا قدم توں دیکھ حد
کچ ہو پڑے گا دیکھ تب توبا کا چابك مار توں
تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائے گا
تب عشق جھگڑا پائے گا خوش مار لے تروار توں
شہباز حسینی کھوئے کر ہر دوجھاں دل دھوئے کر
اللہ آپے یك ہوئے کرتب پاوے گا دیدار توں

اس پوری غزل میں شروع سے آخر تک نفس کی سرکشی کو قابو میں کرنے اور اسے مطیع و فرماں بردار بنانے کے طریقوں کی تعلیم اور اس تعلیم پر عمل کرنے سے نفس مطمئنہ کے دوش پر معرفت حق کے راستے واصل بہ حق کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی خوش خبری دی گئی ہے۔

نفس امارہ کو نفس مطمئنہ میں ڈھالنے کے لیے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے اپنے کلام میں جو کلیدی بات تعلیم فرمائی ہے وہ رزقِ حلال اور توبہ ہے۔

اس غزل میں آپ نے شریعت و طریقت میں اختلاف کرنے والے نام نہاد صوفیا کو یہ منھ توڑ جواب بھی دیا ہے کہ گھوڑے پر سواری کرنے کے لیے جس طرح زین اور زیر بند ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ٹھیک اسی طرح شریعت و طریقت، معرفت نفس کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور معرفت نفس سے ہی معرفت حق کا حصول ممکن ہے۔

اب ذرا عشق حقیقی سے متعلق یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
اور پیو میرے جیو کا برما لیا ہے
جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت گم ہو رہے جیسی میں دیوانے

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؂

مشکل بازی عشق کے چھوٹے جیو کو انا
"موتو قبل ان تموتو" شاھد ھے معنا

(''انتخابِ کلام حضرت گیسو دراز'' شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۰۰ تا ۱۷۰۰ نیز ''دکن میں اردو، نصیرالدین ہاشمی، مطبوعہ ۱۹۸۵ء، ص ۵۳ تا ص ۵۷)

''آبِ کوثر'' میں شیخ اکرام نے خواجہ گیسودراز کی ہندی راگ راگنیوں سے جس دلچسپی کا ذکر کیا ہے، اس کی تائید محی الدین قادری زورؔ کے یہاں بھی ملتی ہے بلکہ موصوف نے تین منظوم بند بھی مثال میں پیش کیے ہیں ؂

کھڑے کھڑے پیو جیو میں اپسیں آپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھ پاوے
جنہ دیکھے اوسی کوں اسے اور نہ بھاوے
کل شے محیط ھے اسی کوں پچھانے
جو کوئی عاشق اس پیو کا اسی جیو میں جانے
اسے دیکھت گم رھے جیسے میں دیوانے

خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائی
جیو کا گھونگھٹ کھول کرپیا مکھ آپ دکھائی
راکھے سید محمد حسینی پیو سنگھ کھیا نہ جائی

(''دکنی ادب کی تاریخ'' محی الدین قادری زورؔ، انتخاب اشعار ص ۱۲)

اگرچہ درج بالا راگ راگنیاں ہندوستانی ہیں، لیکن ان میں حضرت گیسودراز نے بڑے سلیقے سے سلوک ومعرفت کی روح پھونک دی ہے۔ مذکورہ مثالوں میں عشق و دیدارِ معشوق کی شرائط کے بیان میں دل کو مرکزی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یعنی دیدارِ معشوق صفائے قلب کے ذریعہ دل ہی میں حاصل ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی پیرو مرشد اور رہنما کی اہمیت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی قدیم ہندی شاعری کے نمونے اگرچہ بہت کم دستیاب ہوئے ہیں اور ان میں بھی کچھ محققین تذبذب کے شکار ہیں تو کچھ اس وقت تک اس کلام کو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کا نہ ہونے کی بات تسلیم نہیں کرنا چاہتے جب تک اس کلام کا کسی اور شاعر سے منسوب ہونا متحقق نہ ہوجائے۔ یہ تحقیقی بحث اپنی جگہ، لیکن خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ادبی اہمیت کے مسلم ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ہی ادبی سرگرمیوں نے دکن میں آنے والے تین چار سو سال کے لیے اردو کی جڑیں اس قدر مضبوط کردیں جن پر کھڑے تناور درخت کی چھاؤں بعد میں شمال تک بھی پہنچی اور اہل شمال نے ۱۷۲۰ء کے بعد اردو کی وادی میں قدم رکھا۔

دکن کی اردو شاعری میں صوفیانہ روایت شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے، بلاشبہ حضرت بندہ نواز گیسودراز سے ولؔی اورنگ آبادی تک دکن کی شاعری میں تصوف کا رنگ غالب رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کے تتبع میں شمال والوں نے اردو شاعری کی وادی میں جو قدم رکھا وہ تصوف کے اثر سے خالی نہ تھا۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ گیسودراز نے اردو شعر و شاعری کی ایک لازوال روایت کا آغاز کیا خصوصاً تصنیف وتالیف کی طرف توجہ کرکے اردو ادب کی تاریخ کو تاریخ بننے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کا خاص کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تصوف کو فلسفہ وکلام کی بحث سے دور رکھتے ہوئے اس کے احسان وسلوک کے پہلو کو تقویت دی، کیوں کہ درحقیقت ہر انسان کا مقصد اور حق یہی ہے کہ وہ ایک پاکیزہ نفس کا مالک ہو اور تزکیہ نفس کی راہ سے دنیا وآخرت کی منزلیں کامیابی سے طے کرکے معبود ومعشوقِ حقیقی سے واصل ہوجائے۔ خواجہ بندہ نواز نے تصوف سے یہی کام لیا اور آپ نے خدا کو معشوق بنا کر اس منزلِ مقصود تک رسائی کے لیے عشق کی راہ اختیار کی۔ عشق کی راہ طے کرنے کے لیے نفس جیسی سریع رفتار سواری منتخب کی اور نفس کو قابو کرنے کے لیے ذکر معشوق، رزق حلال، ذکر وفکر معشوق اور توبہ کی استعانت کو لازم پکڑ لیا۔ بعد کے پیروؤں کے لیے آپ کی یہی صوفیانہ شاعری نصابِ عشق کی طرح معاون ثابت ہوئی۔ ❀❀

ظہیر محمد
H.O.D, Urdu Man Madhav, College of Art & Science
Vijaypur, Mirzapur-231303(U.P) (Mob.7607427497)

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری: چند نکات

اردو ادب کی تاریخ میں دکنی دور کی قدامت ہی نہیں، اس کی اہمیت اور اس کے اثرات سے بھی ایک زمانہ واقف ہے۔ اس سرزمین پر اردو میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ بہمنی دور سے شروع ہوتا ہے جس کی تفصیلیں ''بیجاپور میں اردو'' کے عنوان سے زیر مطالعہ آتی ہیں۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں جن میں قطب شاہی سلطنت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس دور کے ادب کا سرمایہ ''گولکنڈہ میں اردو'' کے عنوان سے ہمارے سامنے آتا ہے اور اسی کو ''اردو کا قطب شاہی دور'' بھی کہتے ہیں۔ سلطان قلی قطب شاہ وہ پہلا حکمراں تھا جس نے ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء میں اپنی خودمختار حکومت کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد یہ خاندان آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں محمد قلی قطب شاہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لیا۔ وہ شہنشاہ اکبر اور ایران کے بادشاہ شاہ عباس صفوی کا ہم عصر تھا۔ گولکنڈ کے کچھ فاصلہ پر اس نے ایک شہر اپنی چہیتی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر آباد کیا تھا جو آج بھی موجودہ حیدرآباد کی شکل میں موجود ہے۔

قلی قطب شاہ ایک زبردست حکمراں ہی نہیں، زبردست شاعر بھی تھا۔ اس کی شاعری میں ہندوستانیت کی روح جلوہ گر ہے ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی رنگارنگ تصویریں اس کے کلام

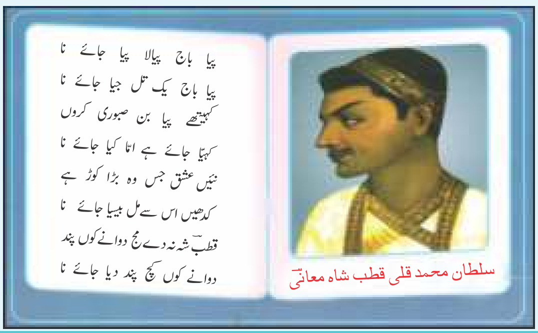

سلطان محمد قلی قطب شاہ معانیؔ

میں نظر آتی ہیں، عید، شب برات، ہولی، دیوالی جیسے ہندوستانی تیوہاروں کا بیان اس کے یہاں بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ مقامی رنگ کچھ اس طرح جھلکتا ہے کہ ہم اس کے کلام سے اس عہد کے رہن سہن اور طرز معاشرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ عاشقانہ مزاج کا بھی مالک تھا جس کا اندازہ اس کی ان نظموں سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی بارہ گوپیوں کی تعریف میں کہی ہیں۔ یہ نظمیں عشق ومحبت کی والہانہ کیفیت کی سچی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ ان میں شاعر نے اپنی محبوباؤں کے سراپا اور حسن کے ناز وادا کی تصویریں دکھائی ہیں۔

قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندی اور سنسکرت کی عشقیہ شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کی کلیات میں مثنویاں، قصائد، مراثی اور غزلیات ورباعیات غرض کہ متنوع اصناف میں تخلیقات موجود ہیں۔ اس کی زبان میں کافی ترقی اور پختگی ہے اور تخلیقات میں ایک ادبی شان ہے۔ جدید نظم نگاروں کی طرح اس نے مختلف موضوعات پر مکمل نظمیں کہیں ہیں۔ ان نظموں میں عشق ومستی اور تصوف کے ساتھ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت کا بھی بیان ملتا ہے۔ اس کی یہ نظمیں اپنے تنوع اور رنگارنگی کی وجہ سے نظیرؔ اکبرآبادی کی یاد دلاتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے موضوعات میں جس طرح ہندوستانی رنگ نمایاں ہیں اسی طرح اس کی زبان پر بھی ہندوستانی زبان کا رنگ غالب ہے۔

قلی قطب شاہ کی غزلیں کیف ومستی میں ڈوبی ہوئی ہیں ان کا نشاطیہ لہجہ ہمیں حافظؔ کی یاد دلاتا ہے۔ دونوں کی شاعری میں نشاط وطرب کی ایک جیسی کیفیت کا احساس ہوتا ہے، لیکن جہاں حافظؔ کے تصور عشق اور ان کی سرمستی وسرشاری میں ترفع ہے، وہیں قلی قطب شاہ کی محبت

جسمانی ہےاوراس کےنشاط وطرب میں سطحیت اور ہوسنا کی کا جذبہ غالب ہے۔اس کی شاعری کے پیچھے اگر چہ کوئی بلند ذہن اور فن کا رانہ شعور نہیں، پھر بھی اس کی شاعری میں تہذیبی نقوش کی رنگا رنگی اور موضوعات کا تنوع آج بھی قابلِ توجہ ہے۔اس کےکلام کا ذخیرہ اس کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے اس کی وفات کے بعد مرتب کیا تھا جسے ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر زورؔ نے نئے سرے سے مرتب کر کے حیدرآباد سے شائع کیا۔

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات ذہن میں آرہی ہے اور شاید اُسے لکھ دینا طلبا وطالبات کے لئے فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ قطب شاہی عہد کے پہلے حکمراں کا نام ''سلطان قلی'' ہےاور یہاں جس حکمراں شاعر کا ذکر ہو رہا ہے اُس کا پورا نام ''ابوالمظہر محمد قطب شـــاہ'' ہے۔اُسے اردو کا پہلا صاحب دیوان ہونے کا شرف حاصل ہے، اس کا کلیات میں ردیف وار تین سو بارہ غزلیں ملتی ہیں جن میں اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار دو سو چون تک پہنچتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے کئی تخلص استعمال کئے ہیں، جن میں محمد، قطب، قطب شاہ، ترکمان اور معانی خاص طور سے مشہور ہیں۔بعض جگہ محمد قلی قطب شاہ کا ایک تخلص ''ظل اللہ'' بھی بتایا گیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی کلیات مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ جب چھپی تھی تو ''ادارہ ادبیات اردو'' حیدرآباد سے اشاعت یافتہ اس کتاب پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے رسالہ ''اردو'' میں اس پر ایک طویل اور دلچسپ مضمون لکھا تھا۔اس کے علاوہ مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری کے ''تذکرہ شعرائے دکن'' اور کریم الدین کے ''طبقات الشعرا'' میں بھی محمد قلی قطب شاہ کا ذکر موجود ہے جس کا حوالہ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی مشہور کتاب ''دکن میں اردو'' میں لایا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد اور آج کے زمانے میں صدیوں کا فاصلہ ہے اور اس لحاظ سے اگر چہ زبان کی قدامت کا معاملہ بالکل فطری ہے، لیکن محمد قلی قطب شاہ کی قادرالکلامی میں بہرحال کسی شک کی گنجائش نہیں بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

''محمد قلی قطب شاہ کا اسلوب بیان نہایت سادہ اور عبارت سلیس ہے۔اس کی شاعری مقامی خصوصیات سے مملو ہے......اوراس کے طرز تخیل پر ہندی شاعری کا بھی اثر ہے۔اس کی غزلوں میں لطافت اور عاشقانہ عنصر بہت ہے۔'' (مختصر تاریخ ادب اردو،ص ۲۵)

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری پر ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' میں لکھا ہے کہ:

''اس نے (اپنی شاعری میں) جسمانی محبت کے تجربات بیان کیا ہے۔اپنی پیاریوں کے جو دلکش اور جاذب نظر مرقعے اس نے پیش کئے ہیں، انہیں اردو شاعری میں سراپا نگاری کا اولین نقش کہا جاسکتا ہے۔اس کی شاعری سے اس کی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے...... (گویا اُس دور کے) پورے تمدن کا حال اُس نے اپنے اشعار میں محفوظ کر دیا ہے۔مناظر قدرت کی عکاسی بھی خوب کی ہے.....محمد قلی قطب شاہ نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی اور غزلیں اور مـــرثیے کہے ہیں۔رنگینی، گھلاوٹ، اثر آفرینی اور دلکشی اس کے کلام میں نمایاں ہے۔وہ حافظؔ کے کلام کا شیدائی تھا اور حافظؔ کی بعض غزلوں کے ترجمے اس کی کلیات میں ملتے ہیں۔''

نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب میں محمد قلی قطب شاہ کے قلم سے حافظؔ کی غزل کے ترجمہ کا نمونہ بھی دیا ہے۔

یوسف گم سوں پھر آ گا اب بہ کنعاں غم نہ کھا
گھر ترا امید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا

محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں سے لئے گئے کچھ اشعار مزید دیکھئے۔

پیـــا بـــاج پیـــالا پیـــا جـــائـــے نـــا
پیـــا بـــاج یک تـــل جیـــا جـــائـــے نـــا
کـہیتھـــے پیـــا بـــن صبـــوری کـــروں
کـہیـــا جـــائـــے ہے امـــا کیـــا جـــائـــے نـــا
قـطـب شـــہ نـــہ دے مـج دوانـے کـوں پـنـد
دوانـــے کـــوں کـــچ پـــنـــد دیـــا جـــائـــے نـــا

(بقیہ ص۱۹ پر)

محمد مستقیم

غالبؔ کی فارسی رباعیوں کا مستقبل

اہالیانِ نظر کہتے ہیں کہ فارسی صنف رباعی کو شیخ ابوسعید، بابا طاہرؔ عریاں، سرمدؔ کاشی اور عمر خیامؔ نے منزل تکمیل تک پہنچادیا۔ خاکسار اُن باکمال استادان فن کا عقیدت مند رہا ہے نہ کہ نکتہ چیں، مگر زمانہ ہرکمالے راز والے کے اصول پر کاربند ہے۔ غالبؔ کے عہد سے الیکٹرانک دور کا آغاز ہوا اور بڑی تیزی سے اس کا سیل حیات کے ہر شعبہ میں داخل ہونے لگا۔ غالبؔ کہہ اٹھے ؎

می تواں پنجه از نظاؔ می برد
پارۂ جمع گر حواس کنم
توسن طبع من بدان ارزد
که ز بال پری قطاس کنم

غالبؔ نے اے۔ٹی۔ایم مشین کا خاکہ پیش کیا، جہاں مشین کے ذریعہ رقوم کا لین دین ہوتا دکھایا گیا ہے۔ (دیکھیں خاکسار کا مضمون، غالب کا اے۔ٹی۔ایم مطبوعہ ''آجکل'' فروری ۲۰۱۲ء) اس دور کا مژدہ غالبؔ نے اپنی ایک رباعی میں یوں پیش کیا ؎

ای کرده به مهر زر فشانی تعلیم
پیدا ز کلاه تو شکوه دیهیم
بادا بتو فرخنده زیزدان کریم
پروانگی جدید و اقطاع قدیم

(اے ایٹم! تو نے سورج سے زرفشانی کی تعلیم لی۔ تیرے نیو کلیس مرکزہ سے تاج کی تابکاری پیدا ہے۔ خدا کے کرم سے تجھے جدید پروانگی 'الیکٹرانکس' مبارک ہو اور تجھ پر پتنگوں کی پیروی کا عہد ختم ہو۔)
غالبؔ اپنی زندگی کے عہد گزشتہ کا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اوراق زمانه در نوشتم و گزشت
در فن سخن یگانه گشتم و گزشت
مَی بود دوای ما به پیری غالبؔ
زان نیز به ناکام گزشتم و گزشت

(میں نے زمانے کے اوراق میں در ہائے ناب جڑے، وہ زمانہ گزر گیا۔ ایک عہد میں میں شعر گوئی میں یگانہ روزگار ہوا، وہ عہد بھی گزر گیا۔ میں نے سمجھا تھا کہ مئے پیری کی دوا ہے، وہ بھی ناکام ہوگئی اور مجھ سے چھوٹ گئی۔)

روئے زمین پر غالبؔ کا کوئی اپنا مکان نہ تھا اور جنت کے مکان پر انہیں بھروسہ نہ تھا۔ دل میں مکان نہ ہونے کی کچوٹ لیے غالبؔ زندگی کے دن کاٹ رہے تھے کہ عارفؔ راہی ملک عدم ہوگیا۔

گھر میں تھا کیا کہ بڑا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

عارف کے سانحہ ارتحال سے قبل کلکتہ کے سفر کے دوران جب غالبؔ بنارس میں چند دنوں ٹھہرے تو بنارس کی آب و ہوا پر فریفتہ ہوگئے اور وہاں گھر بنا کر بس رہنے کا تہیہ کیا، مگر وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا اور غالبؔ سفر کی راہ پر آگے بڑھ گئے۔ بہار میں داخل ہوتے ہی دریائے سوہن یعنی موجودہ سون ندی نے ان کا استقبال کیا۔ غالبؔ اس کا آب حیات نوش کرتے ہیں اور اس کی دلفریب وادی سے فرحت حاصل کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خوشتر بود آب سوهن از قند و نبات
باوی چه سخن ز نیل و جیحون و فرات
این پاره عالمی که هندش نامند
گوی ظلمات و سوهن است آب حیات

(دریائے سوہن کا پانی قند و نبات سے زیادہ شیریں ہے۔ اس کے سامنے نیل، جیحون و فرات کا کیا ذکر، عالم کا یہ حصہ جسے ہند کے نام سے

پکارتے ہیں سانولیوں کا دیس ہے۔اس لحاظ سے یہ گوئے ظلمات ہے اورسوہن اس کا آب حیات۔)

دل تھامے وہاں سے غالب کلکتہ پہنچتے ہیں۔اس سرسبز خطہ ارض کی تعریف میں وہ یوں رطب اللسان ہیں ؎

هر چشمه به بحر هم عنان ست اینجا
هر خار بُنی ثمر فشا نست اینجا
حاصل مرز و بوم بنگاله مپرس
نی خامه هیمه خیز رانست اینجا

(بنگال کی ہرا یک تال تلیا سمندر کی رفیق کار ہے۔ یہاں کے ہر مکان کی باڑھ پھل دار ہے۔ یہاں کی کاشت اور پرتی میں امتیاز کیا۔ یہاں پیلی صحافت کے خامہ کا بھی وقار ہے۔)

غالبؔ هر پرده نوای دارد
هر گوشه دهر فضای دارد
بر چید به پوست دماغم یکسر
بنگاله شگرف آب و هوای دارد

(یہاں ہر گھر سے نغمہ ابلتا ہے۔ یہاں ہر گوشہ ارض کی فضا معطر ہے۔ یہاں باشندوں کی جلدیں ان کے پتے بتاتی ہیں۔ بنگال کی آب و ہوا میں اعجاز ہے۔) جب غالبؔ کہیں اپنا نجی مکان نہ بنا سکے تو کہہ اٹھے ؎

تا چند به هنگامه سلامت باشی
تا چند ستم کش اقامت باشی
گفتی نه باشد شب غم را سحری
حیف ست که منکر قیامت باشی

(تو کب تک ہنگامے سے بچتا رہے گا۔تو کب تک مکان کا ستم جھیلتا رہے گا۔تو کہتا ہے شب غم کی سحر نہیں، ارے تو قیامت کا منکر ہو گیا۔)

آخرش وہ خدا سے سودا بازی پر اتر آتے ہیں ؎

یارب به جهانیان دل خرم ده
در دعوئ جنت آشتی باهم ده
شداد پسر نداشت باغش از تست
آن مسکن آدم به بنی آدم ده

(اے خدا! دنیا والوں کا دل خوش کر دے۔ جنت کے بارے میں ان سے صلح کر لے۔شداد کولڑ کا نہ تھا اس کا باغ تیرے تصرف میں ہے، جو آدم کا گھر تھا اسے اس کے بیٹوں کو دے دے۔)

ای کرده به آرائش گفتار پیچ
در زلف سخن کشوده را خم و پیچ
عالم که تو چیز دیگرش می دانی
ذاتیست بسیط و مسبط دیگر هیچ

اللہ اللہ فطرت کا کتنا بڑا رمز غالبؔ نے افشا کر دیا۔ یہاں گفتار سے مراد کہکشاں ہے۔اس کو سائنس کی زبان میں گیلیکسی کہتے ہیں۔زلف سخن کے خم سے مراد تاروں کی شعاعوں کی ابتدائی کج روی ہے، اسے شائستہ شانہ ہونا ہے۔ ہر گیلیکسی بڑی سرعت سے باہر بھاگ رہی ہے۔ یہ اطلاع اس کی روشنی کی سرخ رحلی (Red-Shift) سے ملتی ہے۔ گیلیکسیوں کے دور بھاگنے کا مطلب ہے کائنات پھیل رہی ہے۔غالبؔ سترہویں صدی کے سائنس داں نیوٹن کی مشہور ایجاد ومنشور (Prism) سے واقف تھے جو روشنی کو اس کے اجزائے ترکیبی میں منقسم کرتا ہے، مگر اس آلے کی مدد سے غالبؔ پھیلتی کائنات کا ادراک حاصل نہ کر سکتے تھے۔خاکسار کے خیال میں غالبؔ کا کشف قرآن کشید ہے۔" کل من علیها فان" غالبؔ کی زیر نظر رباعی اسی کی ترجمان ہے ؎

چون درد ته پیاله با قیست هنوز
شادم که بهار لاله با قیست هنوز
در کیش توکل غم فردا کفرست
یکروزه می دو ساله باقیست هنوز

یہاں پیالہ سے مراد سورج ہے اور لالہ سے مراد دھرتی۔سورج کے قلب میں ہائیڈروجن گیس ملتا ہے۔اس کی تپش سے چار چار ہائیڈروجن مل کر ایک هیلیم ذرہ بنتا ہے۔اس عمل سے کچھ توانائی بچ رہتی ہے۔ایسے بہتر ے اعمال کی کل بچی توانائی بہت ہوتی ہے۔ یہی توانائی دو سال کی مسافت طے کر کے سورج کی سطح سے خارج ہوتی اور ہم تک پہنچتی ہے۔ سورج دوسری فصل کا ایک تارہ ہے۔ وہ ساڑھے چار بلین سال سے چمک رہا ہے اور اگلے ساڑھے پانچ بلین سال تک چمکتا رہے گا۔غالبؔ

کہتے ہیں کہ مستقبل کے متعلق اندیشہ ان کے کیش میں کفر ہے۔سورج ہمیں روز کا اٹھوانا دیتا رہے یہی ہمارے لئے کافی ہے ۔

روی تو بہ آفتاب تابان مانند
خوی تو بہ سیل در بیابان مانند
زین گونہ کہ تار و مار باشد گوی
زلف تو بہ ما خانہ خرابان ماند

(اے دھرتی! تیرا چہرہ آفتاب سے چمکتا رہے۔تیرا گیس اور تیل بیابان میں ابلتا رہے۔ جب سورج کی کرنیں چبھنے اور ڈسنے لگیں تب تیرے قطبین کی لمبی راتیں ہم خانہ خرابوں کی پناہ گاہیں بنیں۔)

یارب سودی بہ روزگاران مارا
وجہ گل و مل بہ نو بہاران مارا
صرف نمك و جو چہ قدر خواهد شد
گنجینہ این صومعہ داران مارا

(یارب ہمیں سوداگروں کا پارٹنر بنادے۔نو بہاروں کا ہمیں ہم پیالہ وہم نوالہ بنادے۔ ہم انہیں نمک اور جو جتنی چاہیں دیں گے تو ان برج بہاریوں کا خزانہ ہمیں دلادے۔)

آنرا کہ زدست بی زری پامال ست
رسوای نیز لازم احوال ست
ما خشك لبیم و خرقہ آلودہ بہ مَی
ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

(جو مفلس ہیں وہ مصائب کی چکی میں پس رہے ہیں۔انہیں ہر در سے رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ہمارے ہونٹ مے کے بغیر سوکھ گئے، مگر ہمارا خرقہ مے سے آلودہ ہوگیا۔ ساقی ہمیں پیالہ کے بجائے جھرنے سے شراب دیتا ہے۔)

ای تیرہ زمیں کہ بود بستر من
ہر خاك کہ با تست همہ برسر من
زر بهر کسان و بهر من دانہ و دام
ای مادر دیگران و مادر من

(اے اندھی دھرتی! تیرا بستر مجھے راس نہیں آتا۔جتنی خاک تو پیدا کرتی ہے سب میرے سر پر ڈال دیتی ہے۔بعضوں کو زر میں رولتی ہے اور میرے لئے دانہ و دام مخصوص کرتی ہے۔اے تو غیروں کی ماں اور میری سوتیلی ماں ہے۔)

غالبؔ بہ سخن گر چہ کست همسر نیست
از نشہ هوش هیچت اندر سر نیست
مَی خواهی و مفت و نغز وانگہ بسیار
این بادہ فروش ساقی کوثر نیست

(شعر گوئی میں غالبؔ کا کوئی مدمقابل نہیں،مگر نشہ سے اس کے سر میں ذرا بھی ہوش نہیں۔اسے شراب چاہیے،اصل اور بہت،مگر مفت۔کیا سمجھ لیا ہے یہ بادہ فروش،ساقی کوثر ہے کیا؟)

رباعی کے موضوع پر یہ مضمون شاید بعض لوگوں کی نظروں میں کچھ تشنہ معلوم ہو،لہٰذا دونوں استادان رباعی کی ایک ایک رباعی نذر قارئین ہے۔بقول خیامؔ ۔

خورشید کمند صبح بر بام افگند
کیخسروی روز بادہ در جام افگند
می خور کہ منادیٔ سحرگہ خیزان
آوازہ اشربو در ایام افگند

(صبح کے شکاری نے کمند سلطان کے کوٹھے پر ڈال دیا۔دن کے تانا شاہ نے رات کے جام سے تاروں کو اچھال دیا۔ سویرے اٹھنے والوں نے صبوحی لینے کی صدا دی جو دن چڑھے''اشربو'' کا ڈانک بن گیا۔)اس کے بالمقابل غالبؔ کی یہ رباعی دیکھئے ۔

صبح ست و همای فیض و گیتی دامی
صبح ست و هوای شوق و گردون بامی
بر خیز و بروزگار هم رنگ برای
با بادۂ نابی و بلورین جامی

(صبح ہوگئی، ہمائے فیض و گیتی دام میں پھنس گئے۔شوق بڑھ گیا۔آسماں تاروں کو لئے چھت پر اتر آیا۔اٹھو اور دنیا کے رنگ میں ڈھل جاؤ شراب صافی کا دور دورہ ہے اور بزم میں سورج کا بلوریں جام ہے۔)

❀❀❀

رئیس الدین رئیس
10/1725, Delhi Gate, Aligarh - 202001 (9808680026)

مجروحؔ کی شاعری میں سیاسی اور انقلابی رمزیت

مجروحؔ سلطان پوری دنیائے فلم اور ادب کے ایسے بلند قامت اور ممتاز ومعروف شاعر اور نغمہ نگار کا نام ہے جو دنیا بھر میں اپنی شناخت قائم کئے ہوئے ہے۔ قتیل غزل مجروحؔ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ کلام کی کم سے کم مقدار سے انہوں نے زیادہ سے زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل کی ہے۔ اس بات کو اُن کی سوجھ بوجھ اور دانشمندی سے ہی تعبیر کیا جائے گا کہ وہ Quantity پر Quality کو ترجیح دیتے تھے۔ تعقل واحتیاط کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اپنی ہر نئی تخلیق کو شاہکار سمجھنے کے بجائے اس کی کمیوں کو دور کرکے اُسے خوب سے خوب تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ یورپ کے شاعر Thomas Gray نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "An Elegy to Church Courtyard" آٹھ سال کی مدت میں تخلیق کی تھی۔ ملٹن کو اپنی معروف ومقبول نظم "Paradise Lost" مکمل کرنے میں اٹھارہ سال لگے تھے اور اسی طرح ایران کے فردوؔسی نے بھی شاہنامہ منظوم کرنے میں اپنی عمر کے تیس سال صرف کردیئے تھے۔ اس کا مطلب اگر چہ یہ نہیں کہ تخلیق جتنی زیادہ مدت میں مکمل ہوگی اتنی ہی معیاری ہوگی، پھر بھی ان مثالوں سے تخلیقی امور میں صبر وضبط اور احتیاط سے کام لینے کا سبق تو بہر طور ملتا ہے۔

مجروحؔ ترقی پسند دور (۱۹۳۶ تا ۱۹۵۵ء) کے شاعر ہیں۔ رشید احمد صدیقی اور جگرؔ مرادآبادی سے انہیں دلی عقیدت تھی۔ جگرؔ نے ممبئی جانے کے لئے ان کی راہ ہموار کی اور وہ فلمی صنعت کے حوالے سے مشہور ایک ایسے میٹروپولیٹن شہر میں جا پہنچے جو سارے ترقی پسند ادبا و شعرا کا مرکز بنا ہوا تھا اور جو صنعتی کارخانوں، محنت کشوں اور مزدوروں کی آماجگاہ بھی تھا۔ اس شہر عروس البلاد میں ترقی پسند تحریک عملی طور پر فعال و سرگرم تھی۔ یہاں ترقی پسندوں کی صحبت میں رہ کر انہیں روسی اشتراکیت اور تحریک کے منشور ومقاصد کو سمجھنے کا موقع ملا جس سے وہ نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ انہیں مارکس کے جدلیاتی مادیت کے فلسفے میں مضمر سماج کے کمزور اور دبے کچلے محنت کشوں اور کامگاروں کو اوپر اٹھانے اور ان کی محنت کا جائزہ حق انہیں دلانے کے لئے جہاد چھیڑنا بھی کار نیک ہی معلوم ہوا، البتہ آزادی کو بحال کرنے، مزدوروں اور عورتوں کو ان کا حق دلانے نیز فسطائیوں اور جاگیرداروں کے خلاف نعرہ جہاد بلند کرنے کی خاطر غزل سے دست بردار ہوکر اپنے ہم عصروں کی طرح محض زور خطابت، گھن گرج اور نعرے بازی سے پر کھوکھلی، سطحی اور سپاٹ نظمیں کہنا انہیں مطلق پسند نہ تھا۔

مجروحؔ شاعری میں شعریت، جمالیاتی وجدانیت، داخلی کیفیت اور آہنگ کی خوشگوار موسیقیت کے اہتمام والتزام کو بہرصورت ضروری خیال کرتے تھے جب کہ نام نہاد ترقی پسند مصر تھے کہ یہ کام ردائف وقوافی کی پابندی اور رمزو کنایے کی زبان میں ممکن نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ عوام میں انقلاب برپا کرنے کے لئے ردائف وقوافی سے معریٰ خطیبانہ آتش بیانی سے معمور سپاٹ شاعری ہی مفید وموثر اور کار آمد ثابت ہوسکتی ہے کیوں کہ اسے ناخواندہ بھی سمجھ لیتے ہیں۔

مذکورہ پس منظر میں مجروحؔ کی خوداعتمادی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے محبوب غزل سے بے وفائی کئے بغیر ایک ایسی نئی راہ تلاش کی جس پر چل کر جہاں اپنے شعری معیار کا وقار برقرار رکھا، وہیں انہوں نے غزل میں سیاسی و انقلابی رمزیت کی مشعل روشن کرکے تحریک کے تقاضوں کا بھرم بھی قائم رکھا اور وہ بھی کردکھایا جو تحریک کے سربراہ اُن سے چاہتے تھے۔

مجروحؔ سلطان پوری بڑے رنگیلے، انوکھے، بانکے، نرالے متوالے اور دل والے ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں دل دھڑکتا ہے، حسن وشباب کی بہار آفرینی گلشن گلشن رقص کرتی ہے، خیال کے جگنو

چمکتے ہیں، رنگ برنگی تتلیاں پھولوں کے لب چومتی ہیں، جذبات کے سمندر مدوجزر کا کھیل کھیلتے ہیں، لفظیات کے صوتی آہنگ سے موسیقی کے چشمے پھوٹتے ہیں، احساس کی گل پوش وادیوں میں گلگشت کرتی نازک خرام ہوا کے جھونکے تتلی بن کر ہر پھول کے لب لعلیں سے سرخیاں چراتے پھرتے ہیں۔ دل کو مست و بے خود بنا دینے والے کچھ ایسی ہی حسن و جمال کی خوشبو سے معطر اور جمالیاتی لطف وانبساط سے معمور ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

دکھلا کے وہ تو لے بھی گیا شوخیِ خرام
اب تک ہیں رقص میں در و دیوار دیکھئے

سینے میں چھپ گیا ہے طلوعِ سحر کے ساتھ
اب شاخِ دل پہ وہ گلِ رخسار دیکھئے

صحرا میں بگولہ بھی ہے مجروحؔ صبا بھی
ہم سا کوئی آوارۂ عالم تو نہیں ہے

ساز اٹھایا جب تو گرماتے پھرے ذرّوں کے دل
جام ہاتھ آیا تو مہرومہ کے ہمسائے ہوئے

نہ مٹ سکیں گی یہ تنہائیاں مگر اے دوست
جو تو بھی ہو تو طبیعت ذرا بہل جائے

اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم
اُٹھنے کو اُٹھ تو آئے ترے آستاں سے ہم

مندرجہ بالا اشعار مریضانہ عشق کی سطحیت اور آلودگی سے پاک صاف ستھرے اشعار ہیں۔ جذبات کی پاکیزگی، صالح فکری لہجے کی نرمی، جذبہ کی گرمی، احساس کی نزاکت، خیال کی لطافت اور الفاظ کی سحر انگیز کیفیت ان اشعار میں موجود ہے۔ مجروحؔ ربودگی وغنودگی اور سرشاری ومستی کے نازک موقع پر بھی حسن وعشق کے درمیان فاصلہ بنائے رکھتے ہیں ۔

دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی
نگاہِ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

مجروحؔ کلاسیکی رنگ کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر عشق و عاشقی کے مضامین پر استوار ہے۔ انقلابی اور سیاسی رمزیت اُس پر مستزاد ہے۔ مجروحؔ کے عشقیہ اشعار کی غنائی کیفیت دل گداختگی اور سوز و ساز کی لطیف جھنکار اپنی جگہ مسلم تو ہے ہی ساتھ ہی جذبات کی مصوری اور مرقع نگاری کے فن میں جمال وکمال کا دلکش مظاہرہ بھی ان کا ایک امتیازی اختصاص ہے۔ حرف و لفظ اور آواز سے جذبات و احساسات کے انسانی پیکروں کی تصاویر بنانا گرچہ انتہائی دشوار کام ہے، مگر مجروحؔ نے ذیل کے اشعار میں یہ کام بھی کر دکھایا ہے ۔

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اُڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

سرخیِ مے کم تھی میں نے چھو لئے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب اربابِ میخانہ کہیں

وہ بعد عرضِ مطلب ہائے رے شوقِ جواب اپنا
کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

یہ نیازِ غمخواری یہ شکستِ دل داری
بس نوازشِ جاناں ، دل بہت پریشاں ہے

جس شئے نے مجروحؔ کی عشقیہ غزل کو سیاسی اور انقلابی رمزیت عطا کر کے انہیں امتیاز وافتخار سے سرفراز کیا، وہ ہے مارکس کی مادی جدلیات کا بنیادی تصور، مظلومیت کی تاریخی قوت کی جبریت وآمریت پر فتح اور اس بات پر یقین کامل کہ حیات وکائنات پر کسی ماورائی قوت کا عمل دخل نہیں ہے بلکہ فنا و بقا مادی تسلسل کے تابع ہیں اور جو فنا ہے وہی بقا بھی ہے یعنی شاخ سے گر کر پھول خاک ہو جاتا ہے اور پھر پھول کی یہ خاک مختلف مراحل سے گزر کر پھر سے شاخ پہ پھول بن جاتی ہے۔ مادی تسلسل کا فلسفہ ونظریہ مجروحؔ کے بیشتر اشعار میں نمایاں نظر آتا ہے ۔

نہ دیکھیں دیر وحرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروحؔ
مسجدوں میں کی میں نے جا کے دادخواہی بھی

مرے پیچھے یہ تو مجال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
کہ نہیں کوئی مرا نقش پا جو چراغ راہ گزر نہ ہو
ترے پاز میں پہ رُکے، رُکے ترا سر فلک پہ جھکا جھکا
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو

مادی تسلسل سے حیات و کائنات کی وابستگی کا تصور انسان کو کسی عظیم طاقت کی گرفت سے آزادی دلا کر اسے اپنی قسمت آپ بنانے کا عزم و حوصلہ عطا کرتا ہے۔یعنی آمریت وجبریت اور فسطائیت ومطلق العنانیت کے جبار وقہار وطن پرستوں، محنت کشوں، کامگاروں اور کسانوں کو کتنا ہی کچلیں، دبائیں مظلومیت کی تاریخی قوت کو ہر حال میں ان ظالموں کو نیست و نابود کر کے اقتدار میں آنا ہے۔فرانس کا انقلاب اس کی مثال ہے،مگر انقلاب قربانیاں مانگتا ہے اور جب کوئی مرد مجاہد ظلم کے خلاف اُٹھ کر کھڑا ہوتا ہے تو تاریخی قوت اس کا ساتھ دیتی ہے یعنی اس کی ہم نوائی میں لوگ اس کے ساتھ آنے لگتے ہیں ۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یہ حوصلہ ہی تو ہے ۔

ہم ہی کعبہ، ہم ہی بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے

شمع بھی اُجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

مقصدیت کی رات میں المناکیاں تاریخی جدلیاتی قوت کے زیر اثر نغمہ نشاط وانبساط بن جاتی ہیں ۔

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ غموں کی سیاہ رات چلے

جگرؔ اور جذبیؔ کے یہاں سیاسی رمزیت بھی مجروحؔ کے اثر سے ہے۔اس سے مشابہ سیاسی انسلاک نے فیضؔ کے یہاں بھی جگہ بنالی تھی۔غرض کہ مجروحؔ نے تحریک کو وقار بخشا اور خوبصورت اور نادر تراکیب کی ایجاد سے بھی ادب کا دامن وسیع کیا ہے۔بحیثیت نغمہ نگار بھی فلمی دنیا میں آخر تک ان کے قدم جمے رہے اور دولت شہرت ان کی کنیز بنی رہی۔ ❁❁

باتیں کہاوت کی

کہاوتوں کے خزانے سے شاید دنیا کی کوئی زبان خالی نہیں۔کہاوت اصل میں وہ اقوال ہیں جن کے پس پردہ عقلمندی اور نصیحت کی کوئی بات چھپی ہوتی ہے۔ کہاوت کی تخلیق کب ہوئی اور اس کا مصنف کون ہے؟اس بارے میں صحیح تاریخ اور نام تو بتانا سخت مشکل ہے،لیکن اتنی بات یقینی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ کہاوت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی زبان کی تاریخ،جب انسان نے بولنا اور بات کرنا سیکھا تو اپنے روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے دوسروں کو بھی بتایا تاکہ وہ اُن سے سبق حاصل کریں۔یہ عقلمندی کی باتیں لوگوں نے اپنے بزرگوں اور دوستوں کی زبانی نہایت دلچسپی سے سنا اور انہیں یاد رکھا۔اس طرح یہ کہاوتیں سینہ بہ سینہ اور پھر کتابوں، کہانیوں، گیتوں اور پہیلیوں کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتی رہیں اور ان میں برابر اضافے ہوتے رہے۔اکثر کہاوتوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے اور وہی کہاوت کے ادھورے مطلب کو مکمل کرتی یا اُس کے بند مطلب کو کھولتی ہے،اسی لئے کسی نے کہاوت کو بند جملے میں کہی ہوئی بات کا نام دیا ہے۔حق گوئی اور بے باکی،کہاوتوں کا نمایاں وصف اور اصل جوہر ہوتا ہے کیونکہ خوبیاں ہوں یا خرابیاں بہرحال کہاوتوں کے ذریعہ انہیں انتہائی صفائی خلوص اور انصاف کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔کہاوت کسی فرد کو نشانہ بنائے یا کسی طبقہ اور جماعت کو،بہرکیف اس کا مقصد محض مذاق اڑانا نہیں بلکہ کمزوری کا احساس دلانا اور عبرت کا سامان لانا ہی ہوا کرتا ہے۔وہ باتیں جن کے بیان کے لئے ایک لمبی تقریر اور طویل تمہید درکار ہو،اکثر کہاوتوں کی مدد سے بڑی آسانی سے سمجھی اور سمجھائی جاسکتی ہیں اور ہلکے پھلکے لفظوں اور اشاروں میں بڑے بڑے مشکل اور سنجیدہ مسئلے حل کئے جاسکتے ہیں۔کہاوتیں صرف دانشمندی کا خزینہ ہی نہیں بلکہ زبان وادب کا گہنا بھی ہیں اور کسی بھی قوم کے تمدن کا ایسا آئینہ جس میں اس کے اخلاق وعادات،رسم ورواج،افکار وعقائد اور سماجی میلانات صاف صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔اردو میں عربی،فارسی،ترکی،ہندی اور دوسری زبانوں کی صدہا کہاوتیں رائج ہیں۔ (ماخوذ: ریڈیائی مقالہ مشمولہ "آواز" جنوری ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر امام اعظم
Regional Director, Maulana Azad National Urdu University
Kolkata 700014 (Mob. 9431085816)

شمیم قاسمی کی غزل گوئی کا اختصاص

وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے آویزشِ دل
غمگساری کے قواعد بھی بدل جاتے ہیں
(نوشاد نوری)

شمیم قاسمی ایسے عہد کے ترجمان ہیں جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے عروج سے انسانی اطوار، رجحانات، رویے، عقیدے، مظاہر حیات، معاشرتی روایات واقدار سب میں تبدیلیاں درآئی ہیں۔ان تبدیلیوں کے سبب جہاں عام حساس و باشعور شخص ہزاروں نامعلوم تیروں کی زد پر پڑا تڑپ رہا ہوتا ہے، وہاں ان سے قوی تر حس وادراک کا مالک شاعر اپنی تڑپ کو شعری پیکروں میں ڈھال کر آویزشِ دل کی رنگا رنگ نقاشی کے ذریعہ تالیف قلوب کیا کرتا ہے،لہٰذا شمیم قاسمی نے بھی اپنے اردگرد کے خارجی حالات، اسباب، محرکات اور واردات سے جو ادراک وعرفان حاصل کیا ان سے پیدا احساسات کے اظہار کے لئے غزل کو وسیلہ بنایا ہے اور خوب غزلیں کہی ہیں۔شمیم قاسمی کی غزلوں میں ان کی آویزشِ دل سے نکلی ٹیس کی لہریں سبک سیر ہیں تو وہیں طرب ونشاط کی اٹھی ترنگیں بھی ٹھاٹھیں مارتی ہیں اوران کی غزلیں بصیرت کو فزوں کرتی ہیں تو حس جمال کو بھی سیراب کرتی ہیں۔

پہلے ان غزلوں سے ان سبک سیر لہروں کو چنتے ہیں جو لوگوں کے اطوار اور حالات کے ضرب سے شمیم قاسمی کے جذبہ واحساس سے اٹھی ہیں،وہ کہتے ہیں ؎

تو نور ہے کبھی سامنے مجسم ، آ
کہ ہو رہے ہیں چراغِ لہو بھی مدھم ، آ
کسی بدن پہ نہیں ہے یقین کا چہرہ
چہار سمت ہے بے چہرگی کا ماتم ، آ

نادیدہ اور نرا کا ررب کائنات کو کبھی لامکاں سے بزمِ امکاں میں، کبھی لباسِ مجاز میں تو کبھی مجسم اپنے بندوں کے روبرو آنے کی آرزو بڑے بڑے شعرا نے کی ہے۔بقول غالبؔ ’’کہ جب دل میں تمہیں تم ہو،تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو‘‘یا جیسے صغیر احسنی کی آرزو تھی کہ ؎

تمہارا جب خیال آیا، دلوں میں روشنی آئی
چمک اٹھتی یہ دنیا بھی جو آتے بزمِ امکاں میں

مگر شمیم قاسمی کے یہاں ایسی آرزو کا اظہار نہیں ملتا، بلکہ رب کائنات کے آگے اس کرب کا اظہار ہے جو کائنات کی اشرف ترین مخلوق کی کارستانیوں سے بڑھی ظلمت کو دور کرنے کی کاوشوں کی ناکامی سے ان کے اندر پیدا ہوا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ تیری اشرف ترین مخلوق اپنی شناخت کھوتی جارہی ہے اور میرا چراغِ لہو جل جل کے بے دم ہو رہا ہے، لہٰذا اب اس کی جگہ خود نور مجسم ہی آئے تو کوئی بات بنے۔اس نوع کے اشعار میں جو درد ہے،اظہار میں جو عجز ہے اس کی تاثیر ماقبل خیالوں سے انہیں ممیّز کردیتی ہے۔اسی طرح کے چند اشعار دیکھیں ؎

جنوں کی حد کوئی ہوتی نہیں مرے مولا
کتابِ دل سے تعلق نہ دین سے رشتہ

میری جڑ میں تیرا ہی تو پانی ہے
میری سوکھی ڈال میں بھی پھل کردینا

بچا کے رکھ مجھے بس ارتدار ذہنی سے
کہ بندہ میں نہ رہوں صرف نام کا تیرا

خدا جانے کیا کیا لکھا جائے گا
ہے زیرِ قلم فکر و فن کا تلذذ

مجھے تو چاہئے اس در سے لذتِ گریہ
وہ در جو سب کا مقدر بدلتا رہتا ہے

یہ اشعار عصری مزاج کے مطابق رجعت پسندانہ فکر کے غماز لگتے ہیں بالعموم ''رجعت پسند'' کا ٹھپّہ لگنے سے بچنے کے لئے جنہیں اس کا ایقان راسخ ہوتا ہے کہ ''میری جڑ میں تیرا ہی تو پانی ہے'' وہ بھی اپنی روحانی حسیت کے اظہار کے لئے ایمائیت کا سہارا لیا کرتے ہیں، لیکن شمیم قاسمی نے اپنی ''شمیم حقیقی'' کو بے محابا بکھیر کر ایک طرف بے چہرگی کے شکار لوگوں سے خود کو ممیّز کیا ہے تو دوسری طرف اپنی روحانی حسیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اس درد اور ٹیس کو بھی خوبصورتی سے اجال دیا ہے جو زمانہ اور گرد و پیش کے حالات سے انہیں ملا ہے۔ ''تو، نور ہے تو کبھی سامنے مجسم آ''، ''کسی بدن پہ نہیں ہے یقین کا چہرہ''، ''کتابِ دل سے تعلق نہ دین سے رشتہ، کہ بندہ میں نہ رہوں صرف نام کا تیرا''، ''ہے زیر قلم فکر و فن کا تلذذ''، ''مجھے تو چاہئے اس در سے لذتِ گریہ'' ان میں بھرتی کے فقرے نہیں ہیں بلکہ اشعار کی فطری تکمیل کرتے الفاظ ہیں جن کی تہوں سے پھوٹنے والی کرنیں موجودہ انسانی سوچ کے دھارے، مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی رویوں کے تاریک پہلوؤں کو روشن کر رہی ہیں جو ہماری فکر کو مہمیز کرتی ہیں۔

شمیم قاسمی نے تقریباً تمام شعبہ ہائے حیات سے وابستہ ''بے چہرہ افراد'' کے رویوں اور روش پر دھیرے دھیرے نشتر زنی کی ہے۔ بطور مثال چند اشعار دیکھیں ۔

خدمت خلق بھی لازم ٹھہری
اب تو محرابِ عبادت سے نکل

منسوب ہوئی مسند شہرت بھی انہیں سے
رشتہ ہے زباں سے نہ جنہیں فن سے تعلق

نہ کچھ حاصل ہوا آداب کہہ کر
انہیں پرنام کرنا چاہئے اب
اسی میں ہے چھپی دانشوری بھی
خیالِ خام کرنا چاہئے اب

جھانک کر اپنے گریباں میں دیکھا کس نے
آئینہ خانہ میں کب جھانکنے والا کرگس

موسم کی ہواؤں میں بھی تیزاب گھلا ہے
ٹھٹھرا ہوا منظر ہے ابھی اپنے وطن کا

کاٹ تو لی ہیں بہت تم نے لہو کی فصلیں
یہ بھی ممکن ہے کہ اب گاؤں کا منظر کاٹو

جو منھ کے بل گرے ہیں ذرا ان سے لے سبق
اپنے سے تو بلند نہ اپنی اُڑان رکھ

اب تو بچے بس ہیلو کہتے ہیں انٹرنیٹ پر
وہ بے چاری کیا ہوئی میں بھی بے چارہ ہو گیا

ہر شعر حالاتِ حاضرہ کے ''برننگ ٹاپکس'' کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان موضوعات کو شمیم قاسمی نے اپنے جذبہ واحساس کی تراوش سے اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا ہے کہ شعر صورتِ حال کے کئی ابعاد کی ترجمانی کرنے لگتا ہے۔ عصری حسیت کا اظہار ہر سخنور کے یہاں ملتا ہے اور خوب ملتا ہے۔ ان میں عمومیت کا عالم یہ ہے کہ بقول راحتؔ اندروی ۔

مسائل ، جنگ ، خوشبو ، رنگ ، موسم
غزل اخبار ہوتی جارہی ہے

لیکن شمیم قاسمی کی غزلیں ایسے عجز بیان کی روش سے خود کو الگ کرتی دکھائی دیتی ہیں اور تغزل کی چاشنی لئے دل و نظر کو برماتی ہیں کیونکہ ان کی غزل ان کے ''کسب'' کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ ان کے یہاں نازل ہوتی ہے ۔

تنہائی میں چپکے سے غزل آن براجی
یعنی کہ سبب ہے کوئی بستر کی شکن کا

ظاہر ہے جب آنکھوں میں رات کٹتے کٹتے کٹتی ہے یا خواب و خیال بھٹی چڑھا ہوتا ہے تب بستر شکن آلود ہوتا ہے۔ اس صورت میں جوجھ رہی زندگی کے خارجی عوامل و محرکات چین اُڑا لے جاتے ہیں تو ان کے یہاں غزل اسی طرح تنقیدِ حیات پر اُتر آتی ہے اور جب احساسات کے وادیٔ ایمن میں ۔

کوئی سانپ دشت بدن سے نکل کر
اٹھاتا ہے چندن بدن کا تلذذ

تب غزل ان کے یہاں طرب ونشاط کا وہ سرجگاتی آن براجتی ہے کہ جس کے بصارت وسماعت سے ٹکراتے ہی عمر رفتہ کو بھی لگتا ہے ع

کچھ رینگتا ہوا سا، بدن میں سسر گیا

اب دیکھیں شمیم قاسمی کے یہاں دوشیزۂ انفاس کی من موجی کے تیور ؂

ساحل پہ وہ سکھانے بدن آئے گی ضرور
یہ سوچ کر ہی پانی کے اندر چھپا ہوں میں

دیکھ کر لوٹتا ہے رقص بدن
کون دیکھے گا گھاؤ سانسوں کا

پوچھو نہ مجھ سے لذتِ دیدار کا فسوں
کچھ رینگتا ہوا سا، بدن میں سسر گیا

بابِ لذت وہ کھلے گا کہ نہ پوچھ
موڈ میں آئے وہ ، تیار تو ہو

کیا خوف کہ ہے چاند سے ہر چیز منوّر
ہے کھیت میں بویا ہوا ارہر بھی مری جان

اس کا بدن اندھیرے میں ہیرے سے کم نہیں
توہین ہے کہ بلب کوئی اب جلایئے

رکھے گی گرم یہ بستر کو چاروں کونے سے
ترے بدن سے جو پھوٹے گی رات بھر کی شعاع

تلاطم میں سانسوں کی بہہ جاؤگے تم
نکالو نہ یوں اپنے من کا تلذذ

جسم کے راستے بہہ جاتا ہے سب
آنکھ کا پانی کہ رخسار کا رس

اس کا یوں کروٹ بدلنا بھی تو معنی خیز ہے
اب کہاں بندش گوارہ، اسپ سرپٹ کے لئے

موجِ دریا میں بس جھاگ ہوتا رہا
اور پھر لگ گیا اک کنارے بدن

گن رہی ہے شکن تو بستر کی
ہڈیاں بج رہی ہیں ٹخ ٹخ ٹخ

رات بھر گرم تھا بدن ، بستر
صبح دم ہوگئے ہیں دونوں یخ

نہیں مضراب سے بجتا یعنی
وصل کا تار بھی کوڑا کرکٹ

ہاتھا پائی سے چارپائی تک
لے تو اپنے ہی موت مر ، مردود

اس طرح شمیم قاسمی نے حسن و جنسیات اور جبلی احساسات کے مختلف رنگ، ڈھنگ، ڈھب، چھب، کھب، چھل اور بل کو اپنی غزلوں میں ڈھالا ہے۔ ان کی غزلوں میں بدن کی جمالیات کی لفظی نقاشی کی دلچسپ شعوری کاوش ملتی ہے۔ شمیم قاسمی کی کئی مکمل غزلیں اسی رنگ میں ہیں تو بیشتر غزلوں کے کینوس میں ایسے شعر اس طرح نظر آتے ہیں کہ دفعتاً کوندا سا لپک جاتا ہے۔

یوں تو اردو شاعری کا ایک دور ہی گزرا ہے جس میں اس رنگ کی غزلوں کا سکہ چلتا تھا، کیونکہ اُس دَور میں عیش کوشی درباری کلچر کا حصہ ہوا کرتی تھی اور شاعری اس کلچر کی ترجمان تھی۔ وہ کلچر تو اپنے سیاسی دست پناہ کے ساتھ دہائیوں قبل فنا ہوگیا، مگر جبلت تو مرتی نہیں ہے، ہاں انسانی وطیروں کے ساتھ اپنا رنگ ڈھنگ بدلتی رہتی ہے اور اسی کے ساتھ آویزشِ دل بدلتا ہے تو غمگساری کے قواعد بھی، اس لئے آج جس رنگ ڈھنگ میں اس کے محرکات ظہور پذیر ہیں، شمیم قاسمی نے انہی کی منظر کشی کی ہے اور خوب کی ہے۔ اس شعوری کاوش کو موصوف باعث افتخار بھی سمجھتے ہیں اور یوں کہا کرتے ہیں ؂

چومتا ہوں کہ یہ قلم میرا
ہے بدن کی جمال کا فاتح

پھر بھی فراقؔ گورکھپوری کی فتوحات کو ابھی شمیمؔ قاسمی نہیں چھو سکے ہیں کہ فراقؔ کے بدنی جمالیات کی سلطنت میں ؎

مری ہر غزل کو یہ آرزو، تجھے سج سجا کے نکالئے
مری فکر ہو ترا آئینہ، مرے نغمے ہوں ترے پیرہن

کا علم یوں لہرا رہا ہے کہ ان کا لفظ لفظ طلسم حسن کا جادو جگا رہا ہے جب کہ شمیمؔ قاسمی کے یہاں ؎

نئی فرہنگ شعر کا ہے کمال
ایک جھنکار ہے پس الفاظ

یہ جھنکار رگِ جاں میں ہیجان پیدا کرتی ہے۔ پھر یہ کہ ان کے یہاں ؎

وہی الفاظ جو متروک ٹھہرے
کسی کا جسم بنتے جارہے ہیں

جو اس موقف کے تحت ہے کہ ؎

ساری اشیاء زوال آمادہ
بچ گئی حسن کی نزاکت کیا

لہٰذا ان کا کہنا ہے کہ ؎

کھونٹے سے کب لگنے کو تھی میری غزل
دشت جنوں میں دیکھ کر رقص بدن

یہی شمیمؔ قاسمی کا فنکارانہ اختصاص ہے۔

ہماری اردو شاعری میں نسائی بدن میں مضمر جنسی لذت و حسن کا اظہار کوئی نئی بات نہیں، ہاں بیشتر اس موضوع کے تخلیقی اظہاریے میں قدرے ہچکچاتے ضرور ہیں اور عام ڈگر پر چلتے رہنے یعنی چراغ سے چراغ جلانے پر ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ عورت کے جسم کی symmetry اس کے خوبرو گداز بدن کی کشش ہمیں دل ہی دل میں لبھاتی ضرور ہے، لیکن اس کا برملا اظہار سب کے یہاں نہیں ملتا اور اگر کچھ ہے بھی تو اس کی حیثیت عمومی سی ہے، لیکن اس کا بولڈ اور خلاقانہ شعری اظہار تمام شعرا کے یہاں نہیں ملتا۔

سچ تو یہ ہے کہ شمیمؔ قاسمی کے یہاں جنس کوئی شجر ممنوعہ نہیں۔ اس معاملہ میں وہ لکیر کے فقیر نہیں اور ہوں بھی کیوں؟ ایک موج خیز بدن میں کائنات کے اسرار چھپے ہوتے ہیں، انہیں خوب پتہ ہے۔ بقول معروف تخلیقی ناقد حقانی القاسمی:

''ایک فنکار عمومی رہ گزر سے جتنا الگ ہٹ کر چلے گا، اتنی ہی اس کے خیال میں جدت وندرت پیدا ہوگی...... وہ کائنات کی تفہیم کے لئے کسی منطق کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ کسی منطقی ترتیب کے وسیلے سے کائنات کے اسرار کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے احساس و وجدان کی منطق سے انکشاف کرتا ہے اور خیال کے دریچے کو کھولتا ہے.....'' (شکیل الرحمٰن کی جمالیات، ص ۸۱)

حقانی القاسمی کا یہ بھی ماننا ہے کہ تنقید اور تخلیق کا رشتہ بھی ایک مباشرتی عمل ہے۔ اس رشتے کو صحیح طور پر سمجھا جائے تبھی تخلیق کے سارے رموز، نشیب و فراز، مدوجزر اور کیفیتیں سامنے آتی ہیں۔ اسی طرح شمیمؔ قاسمی نے تنقید حیات کے لئے جو رنگ وآہنگ اختیار کیا ہے ان میں نیاپن ہے، انفرادیت ہے، سوزِ دروں ہے اور بصیرت افروزی بھی۔ غرض ہر ایک صورت میں ان کی غزلوں کی دل آویزی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ❁❁

سلطان محمد قلی قطب شاہ...... (ص ۹ سے آگے)

جہاں توں واں ہوں میں پیارے، منج کیا کام ہے کس سوں
نہ بت خانے کا منج پروا، نہ مسجد کا خبر منج کوں
جنت ہور، دوزخ ہور اعراف کچ نئیں ہے میرے لیکھے
جدھر توں واں مرا جنت، جدھر نئیں واں سقر منج کوں
جنت کوں ہور دوزخ کوں سوں مسجد بت خانہ کیا
کسے نا جانوں میں معلوم نئیں کوئی تج بغیر منج کوں

یہاں زبان میں قدامت نے اجنبیت ضرور لا دیا ہے، لیکن یہاں عشق میں راضی بہ رضا رہنے اور محبوب کو اپنا مرکز بنا لینے یا یوں کہیں کہ محبوب کے سمت قبلہ پر اپنی کلاہ کج کر دینے کا جو مضمون باندھا گیا ہے وہ بہر کیف تاثیر سے خالی نہیں۔ بلاشبہ عہد قطب شاہی کی متاعِ سخن میں محمد قلی قطب شاہ معانیؔ کی شاعری خصوصاً اس کی غزلیں آبروئے سخن، اعتبارِ سخن اور استنادِ سخن کا درجہ رکھتی ہیں اور بیشک تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ان میں بہت کچھ قیمتی لعل و گہر اب بھی پنہاں ہیں۔ ❁❁

پروفیسر عرفان آصف

Ibraham Shaheed, Purana Shahar, Daudnagar, Aurangabad - 824043
(Bihar) (Mob. 9113710942)

غزل کا مزاج داں: نیر قریشی گنگوہی

فراق گورکھپوری نے غزل کی تعریف میں کہا ہے:

’’غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے......حیات وکائنات کے مرکزی حقائق جوانسانی زندگی کو بے انتہا متاثر کرتے ہیں،ان کے تاثرات کا مترنم اور متناسب الفاظ میں اظہار کرنا غزل ہے۔غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو اپنی نرمی وگداختگی،سخت جانی اور وسعت قلبی کے لحاظ سے ہر زمانے کے مختلف النوع خیالات وکیفیات کے بار کو برداشت کرتی رہتی ہے۔‘‘

درج بالا اقتباس کی باتیں نیر قریشی گنگوہی کی غزلیہ شاعری پر بطریق احسن صادق آتی ہیں۔ نیر قریشی گنگوہی ایک کہنہ مشق استاد شاعر تھے اور معروف شاعر حضرت بسمل سعیدی کے شاگرد خاص۔ان کی شاعری محبت سے عبارت تھی۔وہ اپنے ہر ملنے والے سے محبت سے پیش آتے تھے۔شاعر موصوف ایک شخص نہیں بلکہ مستقل ادارہ تھے ۔ وہ تعلیم اور تعلیمی مسائل پر طویل گفتگو کیا کرتے تھے۔

نیر قریشی گنگوہی نے دوشیزۂ غزل سے عشق کیا۔ان کا عشق دیوانگی کی حد تک تھا۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’انہوں نے شعروشاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا اور مشاعروں اور شہرت طلبی کے دوسرے ہنگاموں سے الگ رہ کر گویا لوح وقلم کی پرورش کی۔اس معانی میں فکروفن سے ان کا یہ ذہنی رشتہ لائق ستائش اور قابل تحسین ہے۔یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے پچھلے تیس، چالیس برس کے دوران اردو شعروادب میں جو تحریکات شدت سے ابھری ہیں، وہ ان سے تمام تر نہیں تو بہت کچھ بے نیاز رہے اورخود ان کا اپنا مشاہدہ اور مطالعہ ہی ان کی شعر گوئی کے لیے ایک خاص تحریک عمل پیدا کرتا رہا۔گزشتہ تقریباً ایک مثلث صدی میں ہماری معاشرت اور تہذیبی ماحول میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اُن سے وہ تاثر قبول کرتے رہے اور اُن کی شاعری ایک خاص احتجاج کی زیریں لہر کے طور پر برابر آگے بڑھتی رہی۔‘‘

مشہور شاعر و ناقد ڈاکٹر شباب للت رقم طراز ہیں:

’’نیر قریشی گنگوہی نے نئی ادبی قدروں اور نظریات سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔غزل جیسی روایتی، لیکن کشادہ دامن صنف میں نئے موضوعات ومسائل، حالات حاضرہ کے تقاضوں، تہذیبی مطالبہ اور سیاسی و سماجی نظام کی ضرورتوں کو سمویا۔ہر چند ان کی غزلوں کے مطالبات وموضوعات سنجیدہ ہیں،لیکن ان کی ترسیل و اظہار میں زبان کی جدت ومناسبت تازہ کار ہے اور نئی شعریت قاری کو متاثر کرتی ہے۔ادب میں جدیدیت کے منفی رجحانات کی اندھا دھند تقلید سے دامن بچا کے خوب سے خوب تر کی جستجو میں وہ کوشاں نظر آتے ہیں۔‘‘

شاعری میں نئی دریافت کا عمل مشکل ترین عمل ہے،لیکن وہ مسلسل اس کے لئے گرداں رہے۔ان کے اپنے لہجے کی انفرادیت انہیں ہمعصروں سے جدا کرتی ہے۔وہ عصر نو کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا ہیں۔ ان کی مقبولیت کا ضامن الفاظ کا صحیح استعمال، سادگی، فصاحت اور تاثیر کا حسین امتزاج ہے۔ان کی غزلوں میں غم جاناں اور غم دوراں کے

تمام جمال وجلال منعکس ہوگئے ہیں ۔

دشمنوں کا ہی ذکر آخر کیوں
معتبر دوستوں کی صف دیکھیں

پر نور زندگی کی سحر کھورہے ہیں لوگ
سورج چڑھا ہوا ہے مگر سورہے ہیں لوگ

لڑنے کو وہ بھی مدّ مقابل ہوئے ہیں آج
پل کر جواں ہوئے جو ہماری پناہ میں

مجھ سے مرے عزیز بھی بدظن ہیں اس لئے
میں حق پرست ہوں مرا لہجہ کرخت ہے

مرے لباس کی سج دھج کو دیکھنے والو
بہت اُداس ہوں پتھر نگل رہا ہوں میں

کتنی زمینیں ہوگئیں رفعت میں آسماں
کتنے ہی آسماں زمیں میں بدل گئے

خیرات جو روز کرے ، صدقہ نکالے
ملتاہے اُسے رزق حلال اور زیادہ

نیّر قریشی کی شاعری میں اخلاقی اقدار کے زوال،شکست وریخت کے موضوعات وسیع تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔گھرداری یاباہری زندگی کے موضوعات بھی ان کی شاعری میں درآئے ہیں۔شاعرکوبے بسی،مایوسی، قدروں کے زوال،خوف،بھوک اوراستحصال کابھی شدت سے احساس ہے۔مجبوری،غلامی سے رہائی،اضطراب،اپنے طور پر جینے کی خواہش اورکشمکش میں شاعرہچکولے کھارہاہےاورہم دیکھتے ہیں کہ بہرصورت وہ کامیابی سےان تمام موضوعات کواپنی شاعری کاحصہ بناتاہے ۔

کوٹھیاں آپ کو مبارک ہوں
ہم کو کچے گھروں میں رہنا ہے

رشوت خوری کی وباپورے ملک میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے۔نیّر صاحب اس خیال کوبہت خوبصورتی کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں ۔

لگے نوٹ گاندھی کی تصویر والے
توسب عرضیاں آئیں منظور ہو کر

آپسی جھگڑے اور بھائی بھائی کے درمیاں بٹوارے کووہ اپنے شعروں میں اس طرح لاتے ہیں کہ سارامنظر بیک نظر سامنے آجاتا ہےاور پھر اطمینان وسرورکاپہلوبھی چھپانہیں رہتا ۔

کھنچ گئی گھر کے آنگن میں دیوار جب
گفتگو بھائیوں پر گراں ہوگئی

بھائی بٹوارہ یہ ہے گھر بار کا دل کانہیں
گرچہ آنگن بیچ کی دیوار ہے اپنی جگہ

نیّر قریشی شوقین مزاج ہیں،نئے مناظر کے جلووں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اورمنظرکشی میں اپناکمال بھی دکھاتے ہیں ۔

اک چاند کسی خواب دریچہ سے جو نکلا
نیّر نے کیا شوق سے بانہوں کو کشادہ

پروفیسرعنوان چشتی ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ترقی پسندی اورجدیدیت کی آویزش سے برسوں اتنا شور برپارہاکہ اچھوں اچھوں کی سماعت بیکار ہوگئی اور بعض تخلیقی فنکارتو اپنی بصیرت تک کھو بیٹھے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ نیّر قریشی گنگوہی نے اس شور کے درمیاں زندگی گزارنے کے باوجود جمالیات اورشاعری کی ان اعلیٰ قدروں کوسرمایۂ جسم وجاں بنایا،جن پراچھی اور سچی شاعری کی بنیاد ہے۔نیّر قریشی کی شاعری کو پڑھ کر مجھے ان کے شعری اورتخلیقی تجربوں میں شرکت کا موقع ملااور میں نے محسوس کیا کہ جوسادگی اورخلوص،دردمندی اور دل نوازی ان کی زندگی میں ہے،وہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔''

نیّر صاحب کے استاد بھائی مخمورسعیدی کے لفظوں میں:

''نیّر قریشی صاحب کے اشعار میں رنگارنگی اورتنوع ہے۔ وہ شعوری اورلاشعوری طور پرایسے مضامین اخذ کرتے

ہیں جو طویل عرصہ کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ وہ عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں تھک ہار کر ٹھہرنے میں عافیت نظر آتی ہے، لیکن ان کے جذبات کی خوبی یہ ہے کہ وہ ابھی بھی کہیں ٹھہرے نہیں ہیں، بلکہ ان کا شعری ذوق اورادبی سفر رواں دواں ہے۔''

نوجوان ناقد حقانی القاسمی کا بیان ہے کہ:

''نیّر قریشی کی شاعری میں مسائل زیادہ ہیں اور داستانیں کم۔ سماج اور سیاست کی سفاک حقیقتوں کو ان کی تخلیقی آنکھ نے ارتکاز وانہماک کے ساتھ دیکھا ہے اور اُسے اپنے شعور کا حصہ بنا کر شاعری کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔''

نیّر قریشی نے اگرچہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن خاص طور سے وہ غزل میں اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے احساسات کو غزل کی زبان دی ہے اور اس طرح عصر حاضر کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ تیز ہے۔ ان کے اشعار میں روایتوں کی پاسداری اور تہذیب کے سرچشمے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔

کوچے کے سبھی لوگوں کی رکھتا ہوں میں خبر
گو خستہ سائبان ہوں خانہ بدوش ہوں

ملتا ہے ہر نفس میں مجھے نور زندگی
قرآن پاک جب سے مرا رہ نما ہوا

خاکساری نے کئے رتبے بلند
ہم کو نیّر عاجزی اچھی لگی

رشتے ٹوٹ جاتے ہیں سارے خیرخواہوں سے
مفلسی میں کوئی بھی ہم نوا نہیں ہوتا

اسلاف کے انمول دفینوں کو کنگھالو
گرنے کو ہے جو سر سے وہ دستار سنبھالو

وطن اپنا جو تھا سونے کی چڑیا
اُسی میں آج بے کاری بہت ہے

بھوک میں بھی ہاتھ پھیلایا نہیں
ہم کو بس فاقہ کشی اچھی لگی

احمد سعید کو کم جانتے ہیں لوگ
مشہور اب زمانے میں نیّر لقب ہوا

یہ فیض دیکھئے مری ماں کی دعاؤں کا
دنیا میں کامیاب ہوں میں حوصلہ لئے

پوری نہ باپ کر سکا فرمائشیں اگر
بیٹے کے پھر جو پڑ گئے ماتھے پہ بل نہ پوچھ

اردو کے مشہور شاعر و ناقد رام پرکاش راہیؔ فرماتے ہیں:

''زندگی کے تعلق سے جناب نیّر قریشی کا شعری رویہ خاصہ متنوع ہے انہوں نے اپنے جذبات واحساسات کا بے باکانہ اظہار کیا ہے، جس سے ان کی ذات اور شعری کائنات میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور شعری نظام خاصا وقیع نظر آنے لگتا ہے۔''

ندؔا فاضلی ان کی شاعری پر اپنی بات اس طرح کرتے ہیں:

''آپ کا کلام رسائل وجرائد میں برابر پڑھتا رہتا ہوں۔ آپ کی غزلیں عصری حسیت سے رچی بسی ہیں۔ بیشتر اشعار یادداشت کا حصہ بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انسانی کرب کے حوالے سے جو موضوعات آپ کے کلام میں در آئے ہیں، وہ قابل توجہ ہیں۔''

نیّر صاحب اپنے اشعار میں ایک اصلاح پسند رہ نما کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی زندگی اور عصری موضوعات پر بھر پور نظر رکھتے ہیں اور آج کے سیاسی اور سماجی حالات پر عمدہ طنز کرتے ہیں۔ وہ ترسیل کے لئے پیچیدہ طرز اظہار کا سہارا نہیں لیتے۔ ان کے اشعار کی زبان میں سادگی کا حسن ہے۔ دلکش انداز بیان، تسلسل، روانی اور الفاظ کا موزوں انتخاب ان کی شاعری کی ایسی خوبیاں ہیں جنھوں نے انہیں شعرا کی صف اوّل میں لاکھڑا کیا ہے۔ ان کے اشعار میں صرف مسائل ہی مسائل نہیں بلکہ ان میں محتاط شعری اسلوب اور فنکارانہ اور جمالیاتی

رنگ وآہنگ بھی ہے۔ان کی غزلوں میں رجائیت کی دھوپ قنوطیت کے بادلوں کو کہیں کہیں چیر کر جھلکتی ہے۔ نیرؔ قریشی گنگوہی کی غزل گوئی کا بانکپن نت نئے رنگ اختیار کرتا ہے اور نئے تصور اور امیجری کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے، یہاں تک کہ فکر و احساس کی شدت اور جذبے کی سرشاری ہم عصر شعرا میں ان کے مقام کو آگے بڑھاتی ہے ۔

شہر بازار میں ذرا گھوم
دیکھ لو اعتبار اپنا تم

مقام اقتدار اس کو بھی ملتا
مگر نیرؔ میں خود داری بہت ہے

بھینس گائے بھی آج بکتی ہے
چاندی سونے کے مول اے بھائی

نہ ہم تین میں اور نہ تیرہ میں یارو
کہ بڑھ چڑھ کے باتیں بتاتے نہیں

تکلف میں طرح داری بہت ہے
ہمارے گھر میں خودداری بہت ہے

کس سے ڈرتے ہیں ہم خدا کے سوا
منھ پہ کہتے ہیں جو بھی کہنا ہے

دارا کے سامنے نہ سکندر کے سامنے
سرہم جھکا سکے نہ تونگر کے سامنے

فرض کیسے پورا ہو، ہاتھ کیسے پیلے ہوں
مفلسی میں بیٹی کی ہوگی کس طرح شادی

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ نیرؔ قریشی اپنی شاعری میں الفاظ کے انبار نہیں لگاتے بلکہ ان کے انتخاب میں تزئین اور تخلیقی عمل سے شعوری معنی اور مفہوم کو بخوبی تمام صیقل کرتے ہیں۔اس طرح بہت سے تجریدی تصورات بھی ان کے یہاں ٹھوس کیفیت اختیار کر لیتے ہیں۔

نیرؔ قریشی کے یہاں عصری حسیت کا اظہار کسی فیشن کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ حساس دل کے مدو جزر سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ موضوعات کا تنوع نیرؔ قریشی کی شعری کاوشوں کا خاص اور نمایاں جوہر رہا ہے۔ان کی شاعری میں کمال کی انفرادیت اور چونکا دینے والی کیفیت ملتی ہے جو بہر حال انہیں اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیاز کا حامل بنا دیتی ہے۔ ان کے فن کا یہ پہلو بھی خاص ہے کہ وہ انتہائی مہارت اور فنکاری سے خیال اور جذبے کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں نیرؔ قریشی کا کلام گواہ ہے کہ وہ مستقبل کی آہٹوں سے باخبر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کی ہمہ صورت رنگارنگی قاری کے ذوق کی ہمہ جہت تسکین کرتی چلی جاتی ہے۔ ❁❁

قافیہ و ردیف کی اہمیت

شاعری کا ذکر آتے ہی قافیہ اور ردیف کی اصطلاح ہمارے ذہنوں میں آجاتی ہے۔اگر چہ جوشؔ ملیح آبادی اور کلیم الدین احمد نے شعر میں قافیہ اور ردیف کے خلاف آوازیں اٹھائی ہیں اور اس کی پابندی کو صنف شاعری کے لئے تنگ دامنی کا باعث قرار دیا ہے۔عندلیبؔ شادانی کھلے لفظوں میں قافیہ کے حوالہ سے شاعر کو اس کا غلام کہتے ہیں، عبادت بریلوی بھی قوافی کو اشعار میں آورد کی کیفیت پیدا کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری چاہے محض قافیہ پیمائی کا نام نہ ہو، مگر قافیہ کی اہمیت وضرورت بجائے خود مسلم ہے۔ یہ قافیہ ہی ہے جس کی بدولت نوع بنوع خیالات و تجربات اور موضوعات کی طرف شاعر کا ذہن منتقل ہوتا ہے، پھر یہ کہ شاعری میں دلوں کو موہ لینے والی نغمگی بھی قافیہ کے استعمال ہی سے اپنے جلوے دکھاتی ہے۔قافیہ کی طرح ردیف کی اہمیت اور ضرورت بھی طے شدہ ہے۔ حالیؔ کے ذریعہ غیر مردف شاعری کی وکالت اپنی جگہ، مگر سچائی یہی ہے کہ ردیف سے اشعار میں موزونیت آتی ہے اور بقول مسعود حسن خاں یہ ردیف ہے جو شاعری میں نغمگی، ترنم اور موزونیت کو بڑھاتی ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ قافیہ اور ردیف سے کسی خاص عہد کے سیاسی و معاشرتی احوال کو سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔(ماخوذ)

پروفیسر شہزادی

Deptt. of Urdu, Bhairab Ganguli College, Kolkata- 700058 (Mob. 8981651149)

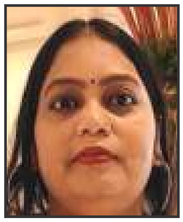

مظفر حنفی کے افسانوں کی جہتیں

کہانیاں انسان کی سنجیدگی، سادگی یا رنگینی کا صرف اظہار نہیں، بلکہ وہ تجربوں اور مشاہدوں کی کڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کی آگ میں فن کار تپتا رہتا ہے، جس کے سبب کہانیاں دل اور ذہن دونوں کے لیے آگہی اور بصیرت کی نئی راہ کھول دیتی ہیں۔

فکشن اور تاریخ دونوں کا تعلق واقعات کے بیان سے ہے، البتہ کچھ فرق یوں رہا کہ تاریخ جہاں حقیقی واقعات سے سروکار رکھتی ہے، وہاں فکشن کا کام گویا جھوٹ کہنے کے فن کی مشق ہے، لیکن اس فن کا جوہر یہ ہے کہ اس نے کتنے زندہ جاوید فن پارے کی تخلیق کی ہے۔ افسانہ ایک پرفریب فضا تیار کرتا ہے اور واقعیت اور حقیقت کی امتزاج سے زندگی کا ترجمان بن جاتا ہے۔ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ واقعات ان کی زندگی میں پیش آچکے ہیں اور وہ حقیقت سے قریب ہوجاتے ہیں۔

افسانہ ایک ایسی نثری صنف ہے، جس میں کسی ایک واقعہ یا زندگی کے کسی ایک پہلو کو کم سے کم لفظوں میں بیان کیا جاتا اور اس کے لئے بیان کا ایسا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے کہ دلچسپی قائم رہے اور افسانہ کا مقصد بھی واضح ہوجائے۔

افسانہ کا فن مغرب کی دین ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز کا دور افسانہ کا اولین دور کہا جاسکتا ہے۔ یہ دور کافی انتشار کا تھا، ہر طرف ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ایک معاشرہ دوسرے معاشرہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بہت سے انقلابات آئے اور نئے عہد کی تعمیر ہوئی۔ ان ناسازگار حالات سے ادب بالخصوص افسانہ متاثر ہوا اور پریم چند نے ''سوز وطن'' سے اردو افسانہ کو زندگی کی حقیقتوں سے قریب کردیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ملک کے ہر خطہ کو المناک سانحے سے گزرنا پڑا۔ قتل وخوں کا سلسلہ عمل اور ردعمل سے دراز ہوتا گیا۔ اس سیاسی افراتفری میں مظفر حنفی نے بطور افسانہ نگار اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں کیا۔

پروفیسر مظفر حنفی کی پہچان بطور شاعر مستند و مسلم ہے، مگر انہوں نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ممتاز شخصیتوں کی دوسری تخلیقات ان کی تخصیصی شہرت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں یا خود قلم کار ہی دوسری صنف کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ مظفر حنفی کے افسانے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے ابتدا میں ۱۹۶۰ء تک افسانوں کا سلسلہ جاری رکھا، مگر بعد میں اس صنف سے چشم پوشی اختیار کرلی اور بطور شاعر و تنقید نگار بلند و بالا رہے۔

مظفر حنفی نے اپنے افسانوں میں بھرپور زندگی کی تصویریں نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ سمودی ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''بھولی بسری کہانیاں'' کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

> ''میں شاؔد عارفی مرحوم کا شاگرد ہوکر شاعری کے چکر میں افسانہ نگاری کے کام کا نہ رہا۔ اسی اثنا میں دوسری زبانوں کی طرح اردو افسانے کا مزاج بھی یک لخت بدل گیا اور آج رام لعل تو کجا اس کے بہت بعد کی پود جس میں جوگیندر پال اور قاضی عبدالستار جیسے اہم نام شامل ہیں، پرانی سمجھی جانے لگی۔'' (بھولی بسری کہانیاں، ص ۹)

مظفر حنفی کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں رام لعل، ذکی انور، اقبال فرحت اعجازی، غیاث احمد گدی اور ستیہ پال آنند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مظفر حنفی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اینٹ کا جواب'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ اکیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''دوغنڈے'' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا، اس مجموعے میں شامل کل افسانوں کی تعداد بارہ ہے۔ تیسرا مجموعہ ''دیدہ حیراں'' ۱۹۷۰ء میں

شائع ہوااور پھر مظفر حنفی نے اپنے تمام افسانوں کو یکجا کر کے ''بھولی بسری کہانیاں'' کے نام سے کتابی شکل میں ۲۰۱۵ء میں شائع کیا۔

''اینٹ کا جواب'' میں شامل افسانوں میں ''مولانا منے''، ''موڑ''، ''سنگ دل''، ''ہم شریف ہیں''، ''ایمان کی بات''، ''مہمان''، ''اینٹ کا جواب''، ''عشق پر زور'' اور ''نقش فریادی'' کامیاب افسانے ہیں۔فراق گورکھ پوری نے ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

''مظفر حنفی صاحب ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک ہونہار ادیب ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ان میں نیا پن ہے۔ان کا انداز دلکش ہے، مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدت ہے۔ پڑھنے والوں کو یہ افسانے کہیں سے گراں نہیں گزریں گے۔ان افسانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر نوجوان مصنف نے اپنی کوششیں جاری رکھیں تو وہ ترقی کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کرتے جائیں گے۔ایسی مختصر افسانہ نگاری جسے ہم حقیقت نگاری بھی کہہ سکیں دنیائے ادب میں سب سے نئی صنف ادب ہے۔'' (اینٹ کا جواب، پیش لفظ، ص۱۳)

فراق گورکھپوری کا خیال اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کی یہ ادبی کاوش اردو ادب کے لیے اہم سرمایہ ہے۔

مظفر حنفی نے قلیل مدت میں ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ان کے افسانے پس پردہ سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں خواہ وہ کسی تعلیم یافتہ نوجوان کی بے روزگاری کا مسئلہ ہو، کسی مفلس کی مجبوریاں ہوں یا کسی سیٹھ کی ہوس کاریاں یا مذہب کے نام پر سماج میں ہونے والی برائیاں، مظفر حنفی نے بڑی بے باکی سے ان کا اظہار کیا ہے۔سماج میں کس طرح صرف پارسائی کا ڈھونگ رچا جارہا ہے۔اس صورت حال کی طرف مظفر حنفی کے نے اپنے افسانہ ''مولانا منے'' میں نہایت فنکاری سے اشارہ کیا ہے:

''میں یہاں سے کتاب لینے پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں مولانا منے اپنے کمرے میں جس کی دیواریں لکڑی کی ہیں، جن میں جگہ جگہ دراڑیں ہیں، بس انہیں میں سے ایک سوراخ سے مولانا جھانک رہے تھے۔ میں چپکے چپکے پہنچا اور انہیں تیزی سے ایک طرف ڈھکیل کر سوراخ سے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔'' ''کیوں......؟'' میری سانس جیسے رک سی گئی ہو۔'ارے یار! دوسری طرف ایک ننگ دھڑنگ عورت نہارہی تھی۔'' (مولانا منے، ص۱۹)

اسی طرح مظفر حنفی کا افسانہ ''موڑ'' دکھاتا ہے کہ نئی نسل کے ایم۔اے پاس نوجوان کس طرح ملازمت کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں۔اس افسانہ کا پلاٹ چست، فضا پراثر اور زبان بامعنی ہے، اقتباس دیکھئے:

اس کے بازوؤں کی مچھلیاں یہ مقدس بوجھ سنبھالنے کے لیے تڑپنے لگتیں، لیکن وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کی ماں اور بہنیں ہمیشہ خطوں میں لکھا کرتی تھیں کہ اس کی ملازمت کے لیے وہ دن رات خدا سے دعا مانگتی ہیں، لیکن شاید اس حاکم اعلیٰ کے یہاں بھی سفارش اور رشوت کی ضرورت ہوتی ہوگی، ورنہ کیا وجہ تھی کہ معصوم دلوں سے نکلی ہوئی پاک دعائیں بام قبولیت کو نہیں پہنچ پاتی تھیں۔''

نوجوان کے ماں باپ بڑی مصیبتوں سے اس کو ایم۔اے کی تعلیم دلاتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ یہ روزگار سے لگ جائے گا تو اپنے بوڑھے والدین کا بوجھ اپنے دوش پر اٹھا لے گا، بہن کی ذمہ داری بھی خوش اسلوبی سے طے کر پائے گا، لیکن وہ نوجوان ایک شہر سے دوسرے شہر جا کر بھی بے روزگار رہتا ہے۔ بے روزگاری کے سبب وہ معاشرے میں نااہلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ایک رئیس اس کو سہارا دیتا ہے، منشا غیر قانونی کام لینا تھا۔جس سے پہلے وہ انکار کرتا ہے، مگر پھر مجبوراً گھر کی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے رئیس کو ہاں بول دیتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجئے:

اور تھوڑی دیر بعد رئیس مالک مکان کے سامنے کھڑا مسکراتا ہوا کہہ رہا تھا۔ جی ہاں! مجھے آپ کے قمار بازی اور خلاف قانون شراب فروشی کے اڈے کا منتظم بننا

منظور ہے۔آپ کی اپنی شرائط پر۔'' (موڑ،ص۴۴)

ڈاکٹرمظفرحنفی اپنے افسانوں میں زندگی کواس کی تمام اچھائیوں، برائیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں اورستم ظریفوں کو بے نقاب کرنے کے جتن کرتے اورکہیں براہ راست اورکہیں بالواسطہ طور پرسماجی ناانصافی اور وقیانوسی اقدار پر تیکھے انداز میں طنز کے جواز تلاش کرتے ہیں۔مظفرحنفی کی خوبی یہ ہے کہ وہ اکثر افسانے کے اختتام کوایک ناگہانی ،مگرموثر موڑ دیتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''اور پھرایک دن وہ بھی آ گیا جب میں اپنی یہ قسم برقرار نہ رکھ سکا تھا۔یہ حقیقت ہے کہ میں نے جہیز وغیرہ کی لالچ میں آکر بھابی جان کی بہن سے شادی ہرگز نہیں کی ،لیکن سات سال تک مسلسل انکارکرتے رہنے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ شگفتہ کی شادی اب کہیں اورنہیں ہوسکتی کیوں کہ میرے ساتھ اس کی نسبت ٹوٹ جانے کو دنیا والوں نے مختلف رنگ دے دے کرا سے خاصا بدنام کر دیا ہےاور پھراچانک میں نے محسوس کیا کہ تم تومحض اپنی حماقت کاخمیازہ بھگت رہی ہو۔میں نے توتمہیں ہرطرح سہارادینا چاہا،لیکن تم نے خود ہی موقع کوٹھکرادیا تھا، پھر مجھے تم سے محبت نہیں صرف ہمدردی تھی اور اب اس ہمدردی پر شگفتہ جیسی بے گناہ لڑکی کوقربان کردینا کوئی انسانیت نہیں کہلائے گی، چنانچہ میں نے شگفتہ کے ساتھ شادی پرآمادگی کااعلان کردیا تھا۔'' (سنگ دل،ص۵۰)

''افسانہ سنگ دل'' میں جاویداورکوثر کی نامعلوم محبت کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وصال کی تدبیر میں اگرچہ ہزارکوشش دکھائی گئی، لیکن آخر میں کہیں سماج،کہیں خاندان کی محبت اورعزت رکاوٹ بنی اور آخرکارجاویدکوسوچناپڑاکہ اس نے کوثر کے ساتھ انصاف کیایانہیں:

''تم نے مجھے سنگدل کہا تھااورتم روتے روتے بے ہوش ہوگئی تھی اور میں نے اپنے آپ کو ہیرومحسوس کیا تھا،لیکن اب کہ تم سینی ٹوریم کے اس بیڈ پر پڑی خون تھوک رہی ہواورڈاکٹر نے تمہارے صحت یاب ہونے کے بارے میں جواب دے دیا ہے اورتم دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھامے ویران نظروں سے مجھے دیکھ دیکھ کرطنزیہ انداز میں مسکرا رہی ہو۔سوچتا ہوں کیا میں واقعی سنگ دل ہوں؟تم ہی بتاؤ کیا میں واقعی سنگ دل ہوں۔''

(سنگ دل،ص۵۰)

انسانی زندگی کے ہر رشتے میں چاہے وہ دوستی کا ہی کیوں نہ ہوکبھی کبھی کسی جانے انجانے معاملے سے نااتفاقی پیدا ہوجاتی ہے یہاں تک کہ رشتے ٹوٹتے ہیں اورشرافت کا گلا گھٹنے لگتا ہے۔اس حوالے سے افسانہ ''ہم شریف ہیں'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

''ہم دلی کے دادے ہیں۔دادے کیا پردادے ہیں۔
جی چاہتا ہے شرافت کا لبادہ اتار پھینکوں اور میں بھی ان کے ساتھ مل کرخرمستیاں کروں،لڑوں اورلڑکرایک ہو جاؤں اور بھونڈی آواز میں الاپوں اور ......پھر سوچتا ہوں میں تو شریف ہوں۔'' (ہم شریف ہیں،ص۷۵)

سماج میں لڑکی کی شادی ایک اہم مسئلہ ہے،لیکن اس مسئلہ کونہایت سمجھداری کے ساتھ ہی سلجھایا جا سکتا ہے۔افسانہ ''بجیا تم کیوں روتی ہو؟'' میں یہی موضوع اُٹھایا گیا ہے۔ یہاں لڑکی کی شادی جلد بازی میں ڈاکٹرسلیم کے بھائی سے کرادی جاتی ہے جوفوج میں نوکر ہے،لیکن اس کے پیر میں رعشہ ہےاوردماغ بھی ڈھیلا۔آخرکاراس غلطی کاخمیازہ لڑکی کواٹھانا پڑتا ہےاس تعلق سے شمواپنی بہن کودلاسا دیتی ہےاوراس طرح کےگھرکےغلط فیصلہ اورسماج کےخلاف آواز بلندکرتی ہے:

''اس بار آپا نے پچھلے تجربے سے سبق حاصل کرتے ہوئے تمام پیش بندیاں کرلی ہیں میرے لیے برتلاش کرتے ہوئے انہوں نے جواحتیاط برتی ہے۔اس کی بھنک میرے کانوں میں پڑ چکی ہے۔انہوں خاص طور پر ایسا برڈھونڈھا ہے جس کے پیروں میں رعشہ اور دماغ میں خلل نہ ہو، جو دولتمند ہو، ،جس کی دولت میں حصہ باٹنے کے لئے کوئی بھائی یا رشتہ دار نہ ہو، جس سے شادی کے بعد مجھے مائکے نہ بیٹھنا پڑے، جو مجھے بڑے

لاڈ پیار سے رکھے۔'' (بجیاتم کیوں روتی ہو؟ص ۸۰)

مظفر حنفی کے افسانے میں حسن بیاں کی نغمگی، تخیل کی بلندی اور احساس کی لطافت جلوہ گر ہے۔ زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ محاورات اور تشبیہات کا بھی نہایت اچھا استعمال نظر آتا ہے اور ان کے افسانوں میں عمدہ پلاٹ، مناظر کی دل کش عکاسی بھی ملتی ہے۔ خاص طور پر ایمان کی بات'' میں نذیر بابا کا کردار قاری کے ذہن میں گہرا نقش مرتب کر دیتا ہے یہ چلتا پھرتا کردار ہمیں اپنے بچپن کی یاد دلاتا ہے:

''وہ ہسوہ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ بچپن میں شریر ضرور تھے، لیکن صرف معصوم شرارتیں کرتے تھے۔ جوانی میں ہمیشہ لنگوٹ کے پکے اور بات کے سچے رہے۔ سیدھی سادی زندگی گزارتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ ٹھاکر جگت پال سنگھ کی بھینس نذیر بابا کے چچا کے کھیت میں گھس گئی۔ بڑے میاں اکڑ باز آدمی تھے، بھینس کو گھیر کر کانجی ہاؤس لے جانے لگے۔ ٹھاکر مانع ہوا۔ نوبت تو تو میں میں سے بڑھ کر لٹھ بازی تک پہنچی۔'' (ایمان کی بات، ص ۸۲)

اردو فکشن میں نذیر بابا جیسے کرداروں کی کمی نہیں ہے، مثلاً رتن ناتھ سرشار کا خوجی بز دل، کرشن چندر کا کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لیے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں اور اپنی نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ مظفر حنفی کے ''نذیر بابا'' کا سراپا دیکھئے:

''قد چھ فٹ کے قریب، بدن پر گوشت برائے نام ہی رہ گیا تھا، لیکن اس کے باوجود ہڈیاں کچھ اتنی چوڑی تھیں کہ دیکھنے میں دبلے نہ معلوم ہوتے تھے چوڑے چکلے شانوں پر اتنا بڑا سر جو کاندھوں کی تقریباً تمام چوڑائی گھیرتا تھا۔ جبڑے کافی اٹھے ہوئے جن کے درمیان پھولی پھولی موٹی سی ناک، جس کے نتھنے دور ہی سے کھلے ہوئے نظر آتے تھے۔'' (ایمان کی بات، ص ۸۱)

مہمان کے آنے پر اس کا پرتپاک استقبال کرنا، اسے خوش آمدید کہنا اور اس کی خاطر مدارات کرنا دنیا کی تمام مہذب قوموں کا شعار رہا ہے، لیکن عصر حاضر میں انسان روز بروز بڑھتی مہنگائی کی مار سے اس قدر ٹوٹ چکا ہے کہ چاہ کر بھی وہ کسی کی خاطر مدارت زیادہ دنوں تک نہیں کر پاتا۔ مظفر حنفی کا افسانہ ''مہمان'' اس کی مثال ہے جس میں منصور اور عطیہ دو حسین جوڑے کی کسمپرسی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے:

''میں نے رات کو تم لوگوں کی گفتگو سن لی ہے۔ معاف کرنا۔ کیا کریں برخوردار زمانہ ہی کچھ ایسا آ گیا ہے کہ ذرائع آمدنی تو بہت کم ہیں اور تکلفات زندگی کا شمار نہیں۔ بہر حال تمہیں کہیں مہمان ہو کر جانے کی ضرورت نہیں ہے آج ہم لوگ گھر واپس جا رہے ہیں۔ دعا کرنا کہ اب ہمارے مہماں وہاں استقبال کرنے کے لیے اب تک موجود نہ ہوں۔' منصور اس بار واقعی روح کی تمام تر شگفتگی کے ساتھ ہنسا، عطیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا، لیکن جانے کیوں ساتھ ہی ساتھ سب کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔'' (مہمان، ص ۹۶)

امیر اور غریب کا فرق و امتیاز، مشرقی خاتون کا جذبہ ایثار، سماج میں عورت کی پسماندگی کے علاوہ تو ہم پرستی اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف جرأت مندانہ آواز بالعموم مظفر حنفی کے افسانوں کا موضوع بحث رہا ہے۔ ان کے افسانہ'' اینٹ کا جواب'' کے کردار راج کمار، لیلا، سیمرتی ایسے عام انسان ہیں جو اپنے طبقاتی اونچ نیچ، ماحول کی سادگی، اپنی نفسیاتی کش مکش اور وہم و گمان کی بھول بھلیوں میں گھوم رہے ہیں:

''میں جس سوسائٹی میں رہتا ہوں' کمار نے دھیرے سے کہا۔ 'وہ ابھی اتنی روشن خیال نہیں، جتنے ہم ہیں۔ ان کی نظروں میں ہم ایک روح کے دو قالب نہیں بلکہ اب بھی وہ تمہیں ایک عیسائی نرس اور مجھے ایک راجپوت افسر سمجھتے ہیں۔ میرا تم سے شادی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے والدین کو خودکشی پر مجبور کروں اور اپنی دو چھوٹی بہنوں کی شادی کے تمام امکانات منقطع کر دوں۔ کتنی

خود غرضی ہوگی۔ کیا ہم محض اپنی خوشی کے لئے اتنے
لوگوں کی حسرتیں لوٹ لیں۔ کیوں میں غلط کہتا ہوں کیا
لیلا۔'' (انیٹ کا جواب، ص ۱۰۱)

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے افسانے میں واقعات کی خوبصورت ترتیب سے پلاٹ کی تعمیر اور مناظر کی دل کشی عکاسی کی ہے اور مختصر فقروں میں اپنی بات سلیقے سے کہہ کر افسانے کے ہنر کو معراج عطا کیا ہے۔ ان کی ''منت کی چادریں'' رنگارنگ کردار نگاری کا آئینہ خانہ بن گئی ہیں:

''میں نے تجھے سب کچھ بتایا ہے۔ یہ بھی کہ مجھے ملازمت اس لئے نہیں ملتی کہ میں اعلیٰ افسران کی سفارش یا رشوت نہیں فراہم کر سکتا پھر بھی تجھے مجھ پر رحم نہیں آیا۔ میں جانتا ہوں تجھے اس طرح رحم نہیں آئے گا مجھ پر، مجھے بغاوت کرنی پڑے گی۔ میں انہیں رشوت دوں گا۔ ہاں میں انہیں نوکری کے لئے رشوت دوں گا۔ بڑی یہ چادریں تجھ سے زیادہ میری مدد کر سکتی ہیں۔'' (منت کی چادریں، ص ۱۱۴)

مظفر حنفی کی توجہ گہرے مشاہدے اور تجربات پر ہوتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کو افسانوں کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان کا افسانہ ''دو ٹکے کا آدمی'' کا ''آنند'' سرکاری نوکری کرتا ہے، لیکن وہ اپنی تنخواہ اعلیٰ افسران کی ضیافت، کلب میں برج اور رمی کی بازی اور ریس کورس میں خرچ کرتا ہے۔ آنند کے روپے اچانک سے غائب ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنے ملازم عزیز پر شک کی بنا پر اس کو گھر سے نکال دیتا ہے، لیکن چوری کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا ہے:

''میری جیب سے پھر تین سو روپئے نکال لئے کسی نے! اس نے شک وشبہ کے ساتھ منولال کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کہیں کچھ نہیں۔ ندامت کی کوئی شکن، پسینے کوئی بوند اس کی پیشانی پر نظر نہ آئی۔ وہی بھولا پن، بے باکی اور معصومیت جو ضمیر کی پاکیزگی کی ضامن تھی۔ آنند نے سوچا یہ شخص تو چور ہو ہی نہیں سکتا، کسی طرح معصوم نظروں سے تاکتا ہے۔ ضمیر میں کہیں کوئی کسک ہو تو نظریں خود بخود جھک جاتی ہیں۔ چھی میں بھی کیسے سیدھے سادے آدمی پر شک کرتا ہوں۔'' (دو ٹکے کا آدمی، ص ۱۲۱)

حالاں کہ اصل میں آنند کا ملازم ''منو لال'' ہی چور تھا۔ آنند سماج کے ایک ایسے کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے جو پیسے کا فضول استعمال کرتا ہے گرچہ منو لال چور تھا، لیکن اس نے ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے چوری کی تھی:

''ہاں صاحب میں نے دیے یہ روپے برج موہن کو، اس بوڑھے نادار برہمن کو اس لنگڑے آدمی کو...... دو کنواری لڑکیوں کو چتا میں پھونکنے کے بعد اب یہ اپنی تیسری بیٹی کو شادی کی پالکی میں بیٹھا کر وداع کرنا چاہتا ہے، سمجھے صاحب اور اس کے لیے اسے جہیز دینا پڑے گا اور آپ کے رشوت کے روپیوں کا اس سے اچھا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے کہ ایک لنگڑے، غریب بوڑھے، اپاہج برہمن دیوتا کے کام آئیں۔'' (دو ٹکے کا آدمی، ص ۱۲۳)

ترقی پسند ادبی تحریک اور جدیدیت کے درمیان ٹھہر ٹھہر کر افسانے لکھنے والے مظفر حنفی کے تمام افسانے مارکسی وجدید رجحانات کے ساتھ سماجی اور اقتصادی اثرات کے حامل ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے انسانی حاجت، امن، مساوات اور حقیقت اور فطرت کا امتزاج، انسانی خواہشات، نفسیات اور کرب کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس حوالے سے ''نقش فریادی'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دراصل میں بے حد اداس ہوں۔ پریشانیوں نے مجھے بری طرح سے گھیر رکھا ہے۔ مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں اس بھری دنیا میں اپنے آپ کو یکہ وتنہا پاتا ہوں، کوئی مونس نہیں کوئی غم خوار نہیں۔ غیر تمند اور حساس بھی بہت ہوں ذرا سی بات کو گھنٹوں محسوس کرتا ہوں۔ وہ معمولی سی تکلیف جو دوسروں کو قطعی متاثر نہیں کرتی، میرے دل میں عرصہ تک کسکتی رہتی ہے۔ مجھے روپیوں کی ضرورت ہے، میری بیوی بیمار ہے اس کے علاج کے لئے، میرا

(بقیہ ص ۳۴ پر)

ڈاکٹر نشاط اختر

Bhagwanpur, Vaishali (Bihar)

باپو: اردو شعر و ادب میں

اردو شعر و ادب کا موضوعاتی تنوع اور انفراد کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ اس زبان کا جہانِ ادب اگر ایک طرف اپنی اسلوبیاتی اور صنفی بوقلمونیت سے اپنی روشن شناخت رکھتا ہے تو دوسری طرف اپنے مضامین و مقاصد کی پیش کش سے بھی اپنی اہمیت اور افادیت کا واضح احساس دلاتا ہے۔ آج کا دور کردار کشی اور شخصیت فراموشی کی وبائے عام میں چاہے کتنا ہی مبتلا کیوں نہ ہو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کے شعرا اور ادبا نے بہرصورت شخصیت شناسی کی صالح روایت کل بھی زندہ رکھا تھا اور انہوں نے اُسے آج بھی مرنے نہیں دیا ہے۔ ہمارے اس دعوے کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ اردو میں کل بھی نہ صرف غالبیات اور اقبالیات کے ساتھ ساتھ ابوالکلامیات اور ''گاندھیات'' پر تسلسل سے لکھا جاتا رہا بلکہ آج بھی نہایت تواتر سے لکھا جا رہا ہے۔

دیگر موضوعات سے قطع نظر جہاں تک ''گاندھیات'' یعنی باپو کی زندگی، ان کی شخصیت اور اُن کے کارناموں کو مختلف نظر اور نظریہ کے ساتھ متنوع پہلوؤں سے ادب و شاعری کا حصہ بنانے کی بات ہے، یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوسکتا کہ اردو شعر و ادب کے فنکار اس راہ میں ہمیشہ ہی اپنی بہترین صلاحیتوں اور مخلصانہ ذہنیتوں کے نقوش ثبت کرتے رہے ہیں۔

اس تعلق سے اردو نثر کے سرمایہ پر نظر ڈالیں تو یہ بات یقیناً ڈھکی چھپی نہیں رہے گی کہ نثریات میں گاندھی جی پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بجائے خود دو بنیادی دستوں میں تقسیم ہے۔ یعنی ایک طرف گاندھی جی پر براہ راست تصنیفات و تالیفات اور دیگر زبانوں سے تراجم کا سلسلہ ہے اور دوسری طرف بالواسطہ طور پر اُن کتابوں کا سلسلہ جو ناول، افسانے اور دیگر نثری اصناف کی صورت میں لکھی گئی ہیں۔ نہ صرف منشی پریم چند کی بہت ساری کہانیاں اور ''میدان عمل'' اور ''چوگان ہستی'' جیسے اُن کے ناول ''گاندھیات'' سے وابستہ ہیں بلکہ پنڈت بدری ناتھ سدرشن، علی عباس حسینی، رامانند ساگر اور حیات اللہ انصاری کے افسانے اور اُن کے مشہور زمانہ ناولوں کو بھی ''گاندھیات'' سے بے علاقہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ''اور انسان مرگیا'' جیسے ناول کی ورق گردانی ہو رہی ہو یا ''لہو کے پھول'' دیکھے جا رہے ہوں، بہرکیف باپو سے ملاقات لازمی ہے۔

علاوہ ازیں جہاں تک تراجم کی بات ہے، عابد حسین کے قلم سے گاندھی جی کی خودنوشت کا ترجمہ ہو یا عبدالغفار کے قلم سے راجندر پرشاد کی کتاب کا ترجمہ ''باپو کے قدموں میں'' یا پھر حامد اللہ افسر کی کاوش ''حیات گاندھی'' یہ سب ''گاندھیات'' کا ہی حصہ ہیں، اسی طرح مجلّاتی صحافت کے خصوصی نمبرات، گاندھی جی کی یاد میں خصوصی گوشہ کے مضامین، بچوں کے لئے باپو کی زندگی اور ان کے اپدیش پر لکھی گئیں کہانیاں اور دیگر تحریریں بھی، یقیناً ''گاندھیات'' ہی کے سرمائے میں اضافہ ہیں۔ گویا اردو نثر میں، بڑوں کے لئے ہی نہیں بچوں کے لئے بھی باپو کی یادوں اور باتوں سے جڑی ہوئی ادبی نگارشات کی کمی نہیں۔ بیشک ''گاندھیات'' ایک سدابہار موضوع ہے جس پر نثری ادبی تحریروں میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے اور یہی کیفیت منظوم ادبی تحریروں کی بھی ہے۔

شروع سے اب تک شاعری کی زبان میں باپو کی حیات و خدمات، ان کی شخصیت اور اُن کے پیغامات پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اُسے بھی سہولت کے خیال سے دو حصوں میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک حصہ وہ ہے جو وقتاً فوقتاً گاندھی جی کی زندگی میں اور ان کی سالگرہ کے موقع پر لکھا گیا اور دوسرا حصہ وہ جو ۳۰؍جنوری ۱۹۴۸ء کے سانحہ پر لکھا گیا اور اُس کے بعد سے آج تک لکھا جا رہا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گاندھی جی کو اردو سے بے پناہ محبت تھی اور اردو کے مصنفین اور شعرا بھی اُن سے ٹوٹ کر پیار کرتے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب باپو اپنی ظاہری زندگی میں تھے، تب بھی اُن کی سیاسی زندگی کے مختلف واقعات پر شعرائے کرام نے نظمیں لکھیں، اُن کے خیالات اور اعلانات کے تذکرے کئے اور ۲/اکتوبر کی آمد پر اُن کے نام تہنیتی نظمیں سپردِ قلم کیں اور جب وہ اپنی حیات ظاہری میں نہیں رہے، تب بھی انہیں ''شردھانجلی'' پیش کرتے ہوئے طرح طرح سے اپنے جذبات کا اظہار کیا، اپنے آنسوؤں کے نذرانے پیش کئے اور اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا عزم مصمم دہراتے رہے۔

اردو شاعری میں گاندھی جی کی شہادت اور ان کے مشن پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں، اُن میں جوشؔ ملیح آبادی کی نظم ''السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام'' اور شمیمؔ کرہانی کی نظم ''جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے'' خاص طور سے مشہور زمانہ ہے۔ ان نظموں کے علاوہ جگرؔ مرادآبادی، تلوک چند محرومؔ، مجازؔ لکھنوی، جمیلؔ مظہری، عرشؔ ملسیانی، آنند نرائن ملاؔ، جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، آل احمد سرورؔ، انورؔ صابری، وامقؔ جونپوری، ساغرؔ نظامی، جاں نثار اخترؔ، خلیل الرحمٰن اعظمی، جگن ناتھ آزادؔ، سلامؔ مچھلی شہری، احسان دانشؔ، رفعت سروشؔ، سیمابؔ اکبرآبادی اور امنؔ لکھنوی وغیرہم کی وہ نظمیں بھی موجود ہیں جو باپو کی یاد میں سپرد قلم ہوئی ہیں، لیکن یہاں اُن نظموں کی تفصیل میں جانے کی بجائے، صرف اُن نظموں تک میں اپنی گفتگو محدود رکھنا ہی مناسب سمجھتی ہوں جو باپو کی زندگی میں لکھی گئی ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ گاندھی جی کی بے مثال شخصیت اور ان کے افکار و نظریات نے روز اول سے ہی اردو کے عظیم شعرا کو متاثر کیا تھا، یہاں تک کہ ان شاعروں نے بھی جو ''مدخولہ گورنمنٹ'' تھے یا کسی اور جہت سے گاندھی جی کے پوری طرح سیاسی ہم نوا نہ تھے، ان کی اس بلند مرتبہ شخصیت کے بیان میں خود کو کسی تعصب کا شکار نہ ہونے دیا۔ علامہ اقبالؔ کی اُس نظم کو جس میں ''وہ مرد پختہ کار، حق اندیش و باصفا'' کا مصرع آیا ہے اگرچہ بعض حضرات نے کسی اور شخصیت سے منسوب ہونے کا خیال ظاہر کیا ہے، لیکن گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی نے اسے گاندھی جی کی شان میں ہی تسلیم کیا ہے اور پھر اقبالؔ کے دیگر مصرع سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کو ''رشی'' کے منصب کامل قرار دیا ہے۔

اکبرؔ الٰہ آبادی اگرچہ گاندھی جی کی تحریک کے ساتھ نہ تھے، مگر ان کی ہمہ گیر شخصیت کے قائل ضرور تھے۔ اکبرؔ کا ''گاندھی نامہ'' اس بات کا گواہ ہے کہ وہ ''ترک موالات'' کی اہمیت بہرحال سمجھتے تھے ۔

کہا گاندھی سے موزوں نہیں آپ کا کلام
ہنس کے بولے کہ مقفٰی ہے صریحاً یہ کلام
آپ کا زور تو جنگی نئے آلات میں ہے
قافیہ اس کا فقط ترک موالات میں ہے

ہم میں سے بھلا کس نے چکبستؔ کی نظم کا یہ شعر نہیں سنا ہوگا کہ ۔

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبستؔ نے ''وطن کا راگ'' کے عنوان سے یہ نظم ۱۹۱۴ء میں لکھی تھی، اسی نظم میں یہ شعر بھی ہے ۔

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جن کو پہنا ہے

چکبستؔ نے ۱۹۱۷ء میں ایک غزل کہی تھی، اس کا یہ شعر بھی گاندھی جی کے لئے دعائیہ کلمات سے لبریز ہے ۔

دم سے گاندھی کے رہے شور وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے ، کوہ پہ فرہاد رہے

اسی طرح ''جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کی گرفتاری پر'' تلوک چند محرومؔ نے جو نظم لکھی تھی اس میں بھی یہ دعائیہ شعر موجود ہے ۔

خدائے پاک کی رحمت جناب گاندھی پر
ہوئی ہے جس کی ہر اک آرزو نثار وطن

گاندھی جی کو بمبئی کی عدالت سے جب چھ سال کی سزا ہوئی تھی تو اُس وقت مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم لکھی تھی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے ۔

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادی حیات کا سامان کر دیا

حقیقت یہ ہے کہ اردو کی نظمیہ شاعری مہاتما گاندھی کے نوع بنوع ذکر سے

بھری پڑی ہے۔اگر گوپی ناتھ امنؔ نے باپو کے مقولات کو منظوم ترجمہ کا لباس دیا ہے اور بسملؔ سعیدی نے ''گاندھی جینتی''اور منوہر لال قمرؔ نے ''جنم دن پر مبارکباد'' کے عنوان سے نظم لکھا ہے تو گاندھی جی پر ٹیگور کے خیالات کا بھی اردو نظم میں ترجمہ ہوا ہے اور سروجنی نائیڈو نے بھی ''گاندھی جی'' کو یاد کیا ہے۔گاندھی جی کی شخصیت پر اگر ''بادشاہِ وطن'' کے عنوان سے نسیمؔ امروہی کی ''مہاتما گاندھی'' کے عنوان سے منوہر لال شبنمؔ کی اور ''میرا گاندھی'' کے عنوان سے اودھ کشور کشتہؔ کی شاندار نظمیں ملتی ہیں تو گاندھی جی پر مہر لال ضیاؔ، فدا فیضؔ آبادی، سلیم ناطقؔ اور روزنامہ ''تیج'' کے مدیر رام لعل ورما کی نظمیں بھی ہمیں متوجہ کر لیتی ہیں ؎

طاقت کب رہین زور جسمانی ہے
سر چشمہ جو اس کا ہے ، وہ لافانی ہے
سچ بات کہی مفکر اعظم نے
طاقت مرہونِ عزمِ انسانی ہے

(گوپی ناتھ امنؔ)

آج ارض ہند پر پیدا ہوا وہ نیک نام
آسمانِ ہند کرتا ہے جسے جھک کر سلام

(بسملؔ سعیدی)

دل قوم کا اک گھر ہے تو مہمان ہے گاندھی
بے تاج مرے ہند کا سلطان ہے گاندھی
آ ، اس کے جنم دن پہ نئے گیت سنائیں
بھارت کے غلاموں کا نگہبان ہے گاندھی

(منوہر لال قمرؔ)

وطن کے غریبوں کا غم کھانے والا
خطرناک رستوں پہ بڑھ جانے والا
تڑپ کر ستم گر کو تڑپانے والا
اہنسا کی طاقت کو دکھلانے والا
سپاہی وہ کمزور ہندوستاں کا
لرزتا ہے دل جس سے ہر حکمراں کا

(نسیمؔ امروہوی)

اے کہ تو ہند کا سرتاج کرم چند گاندھی
تیرے سر دنیا نے دستار فضیلت باندھی
آج سنسار میں آئی ہے غضب کی آندھی
کشتی منجدھار میں ہے اور ہے تو ہی مانجھی
ہاتھ میں ستیہ اہنسا کا ہے پتوار ترے
ظلم کی لہریں قدم چومیں گی ہر بار ترے

(منوہر لال شبنمؔ)

سدرشن چکر سا جب اپنا چرخہ وہ چلاتا ہے
زمانہ کیا ، زمیں کیا ، چرخ بھی چکر میں آتا ہے
انوکھا لڑنے والا ہے ، نرالا ملنے والا ہے
مقابل میں نہ جس کے کوئی گورا ہے نہ کالا ہے
ستارہ ہند کا تابندہ کر لے گا تو دم لے گا
وہ گاندھی ہم کو کشتہؔ زندہ کر لے گا تو دم لے گا

(اودھ کشور کشتہؔ)

ایشیا کی انجمن میں کیف برساتا ہے تو
سونے والوں کی رگوں میں خون دوڑاتا ہے تو

(ضیاؔ)

تو نکلا جیل سے گویا کہ ہنگام عمل آیا
گھٹائیں آسماں سے ہٹ گئیں ، سورج نکل آیا

(فداؔ)

دنیائے نو کا گاندھی آیا پیام لے کر
آزادئ وطن کی ہر صبح و شام لے کر

(سلیم ناطقؔ)

اے امیر حریت اور اے وطن کے تاجدار
تیری ہستی ہے وقار ہند کی آئینہ دار
شش جہت کی کامرانی تیرے قدموں پر نثار
تیرے آگے ، ہیچ ہے سب تاجداروں کا وقار
مرحبا اے قوم کے سالار اعظم مرحبا
مرحبا اے ملک کے سردار اعظم مرحبا

تو نے بتلایا سیاست اور صداقت ایک ہے
تو نے دکھلایا کہ طاقت اور شرافت ایک ہے
تو نے سمجھایا جہان رنج و راحت ایک ہے
تو نے پرچایا کہ بس راہِ طریقت ایک ہے
تیری ہے تلقین ہے ملک وقوم کی خدمت کرو
بہر آزادی جیو ، اور بہر آزادی مرو

(رام لعل ورما)

اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ترقی پسند شعرانے بوجوہِ چند گاندھی جی کی شخصیت کو سامنے نہیں لایا، لیکن اس سے قطع نظر جہاں تک مجموعی صورتحال کا معاملہ ہے، یہ کہتے ہی بنتی ہے کہ اردو کے شعرا باپو کی زندگی اوران کی تعلیمات سے متاثر ہوکر، انہیں مسلسل اپنی نظموں میں جگہ دیتے رہے اور ۱۹۴۶ء تک سیاسی لحاظ سے ''گاندھی جناح ملاقات'' جیسے ہنگامی موضوع پر کیفی جیسے شعرا نظمیں لکھتے رہے۔علی جوادزیدی، فضل نقوی اورمہاراج بہادر برقؔ کی نظمیں ہوں یا ۱۹۴۲ء کی ضبط شدہ نظمیں بہرحال ''گاندھیات'' سے ان کا رشتہ مضبوط ہی نہیں بہت مضبوط ہے۔

مجموعی طور پر ''گاندھیات'' کا اردو شعری سرمایہ مختلف صنفی ہیئتوں کا حامل ہے۔ نہ صرف نظموں میں بلکہ قطعات و رباعیات کی صورت میں بھی شعرا نے باپو کے متعلق اپنے جذبات و خیالات کو شاعری کی زبان بخشا ہے۔ یہ متاعِ شاعری یقیناً بہترین اور پرتاثیر

اسلوب و آہنگ سے مزین ہے اور پھر یہ کہ مضامین اور بیانات کے لحاظ سے اُن میں شعرائے کرام نے گاندھی جی کی زندگی، ان کی شخصیت اور ان کی کامیاب جدوجہد کے نقشے لفظوں میں سمیٹ لئے ہیں اور ان کے اہم تصورات کی بہت ہی عمدہ واضح ترجمانی کی ہے۔مثلاً رفعت سروش کی نظم ''نذر گاندھی'' کا یہ اقتباس دیکھئے ۔

اب سے سوا سو سال پہلے ہند میں ایسا ہوا
گجرات کے گلزار میں اک پھول اہنسا کا کھلا
یہ پھول موہن لال تھا ، شاخ کرم چند پر کھلا
کیا جانے کتنی نیکیوں کا مل گیا اس کو صلا
مشہور گلشن میں ہوا گاندھی کے پیارے نام سے
اس کی مدھر بانی سے انگریزوں کے دل تھرا اٹھے
گاندھی نے اپنی روح کی آواز پر نعرہ دیا
صیاد کو معلوم ہو ہتھیار اہنسا ہے مرا
اے سامراجی شاطرو ، لے آؤ تم تیغ و تفنگ
ستیہ گرہ کے بل پہ ہم کرتے رہیں گے تم سے جنگ
جوش عمل پیدا ہوا گاندھی کی اس آواز پر
تفریق مذہب چھوڑ کے سب ہوگئے سینہ سپر
انگریز اپنی چال پر خود مات کھا کر رہ گیا
ہندوستاں کو آخرش آزاد ہونا تھا ہوا

مذکورہ نظم ۱۹۹۶ء میں لکھی گئی تھی۔اس لحاظ سے اس میں ''سوا سو سال'' کی بات آج ڈیڑھ سو سال کی بات ہوچکی ہے۔گویا تاریخ نے ''گاندھیاتی'' حقائق پر مزید ربع صدی کی مہریں ثبت کردی ہیں۔بیشک ہزاروں سال نرگس اپنے بےنوری پہ روتی ہے، تب کہیں زمانے میں کوئی گاندھی سا بشر جنم لیتا ہے۔(علی جواد زیدی کی کتاب ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال'' اور مجاور حسین رضوی کی کتاب ''اردو شاعری میں قومی یکجہتی'' کے علاوہ امنؔ لکھنوی کی کتاب ''عقیدت کے پھول'' اشاعت ۱۹۶۹ء اور ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ گاندھی نمبر ۱۹۹۶ء سے خصوصی استفادہ) ❁ ❁

☆ انسانی بہتری کے لئے نت نئے کرم کرتے رہنا ہی اصل دھرم ہے
☆ ضرورت سے زیادہ اپنے علم پر یقین کرنا بیوقوفی ہے
☆ جس دن سے ایک عورت رات کو سڑکوں پر آزادانہ طور پر چلنا پھرنا شروع کر دے گی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان نے آزادی حاصل کرلی ہے۔ (باپو)

منظر ریونڈھوی

At. Chandpur Fatah, P.o. Ariarpur, Dist. Vaishali - 843102 (Mob. 9939311612)

منفرد لہجے کا شاعر: فراقؔ گورکھپوری

فراقؔ ایک منفرد لہجے کے شاعر تھے۔ وہ اپنی ایک الگ پہچان رکھتے تھے۔ جہاں تک فراقؔ کی انفرادیت اور انداز بیان کی ندرت کا سوال ہے انہوں نے نہ صرف مغربی ادبیات سے دلچسپی رکھی بلکہ ہندی اور سنسکرت ادب سے بھی انہیں گہری واقفیت تھی، یہی وجہ ہے کہ فراقؔ کی شاعری کا لب ولہجہ اپنے سکون، نرمی اور ٹھنڈک جیسے اوصاف سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔ ''روح کائنات''، ''روپ''، ''شبستان''، ''مشعل'' اور ''نغمہ گل'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انگریزی ادب کے مشہور ناقد Mathew Arnold کا قول ہے کہ شاعری زندگی کی تنقید ہے اور فراقؔ کی شاعری میں ہمیں وہ چیز بدرجہ اتم دیکھنے کو ملتی ہے۔

رُکی رُکی سی شب مرگِ ختم پر آئی
پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

فراقؔ نے ہمیشہ ہی کلاسیکی مزاج اور روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں دلکشی، لچک اور جدت پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش بھی کی جس کے باعث ان کے کلام میں نیا پن اور اچھوتا پن پیدا ہوا۔

ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

فراقؔ کا اصل نام رگھو پتی سہائے اور وطن گورکھپور ہے جہاں ان کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ہوئی اور ۱۹۸۲ء میں اپنے حقیقی معبود سے جا ملے۔ فراقؔ نے بنیادی تعلیم اپنے والد منشی گورکھ پرساد سے حاصل کی اور سات برس کی عمر میں مقامی اسکول میں داخلہ لیا۔ ذہین ہونے کے سبب ہر کلاس میں کامیابی حاصل کرتے رہے اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے الہ آباد میو سنٹرل کالج میں نام لکھوایا، جہاں ان کا واسطہ پروفیسر ناصر سے ہوا جنہیں شعر و شاعری سے بے حد دلچسپی تھی۔ فراقؔ کے دل میں بھی پروفیسر موصوف کی صحبت نے شاعری کا ذوق پیدا کر دیا اور ان سے ہی انہوں نے اپنے کلام پر اصلاح بھی لی۔

فراقؔ کی شاعری میں بلاشبہ احساس غم کے عناصر ملتے ہیں، مگر ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ غم کے بیان میں بھی وہ ہنستے کھیلتے رہتے ہیں۔

فراقؔ غم بھی ہے میرا حریف زندہ دلی
فسردگی میں بھی یاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

فراق، مصحفیؔ کے چاہنے والے تھے۔ چنانچہ ان کے کلام میں بھی لہجے کی گھلاوٹ اور عشق کی نرم نرم کیفیتیں ملتی ہیں۔ ذوقؔ، میرؔ، داغؔ کا اثر بھی ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے کالی داس، شیلی، ٹیگور، سورداس، کیٹس اور ورڈز ورتھ سے بھی کسب فیض کیا ہے۔

فراقؔ کی شاعری میں جو تنوعات ہیں اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ انہیں اردو ہندی اور انگریزی ادب کے علاوہ عالمی میلانات کا بھی خاصہ علم رہا، لہٰذا انہوں نے اپنی شاعری میں جسمانی خطوط اور جنسی لوازمات کو بھی خاص انداز سے پیش کیا ہے۔

قامت ہے کہ کہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے
جوبن ہے کہ ہے چشمہ خورشید میں طوفاں

اگر ان کی غزلوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اکثر مجرد خیالات کو محسوس و مجسم شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ وطنیت کا احساس، پرانی تہذیب سے لگاؤ ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ فراقؔ نے انگریزی ادب کو نہ صرف پڑھا بلکہ اس کے معلم بھی رہے۔ ہندو دیومالا بھی ان کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب فراقؔ کی آواز دور سے پہچان لی جاتی ہے اور دور تک پہنچتی ہے۔

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فراقؔ کی شاعری میں تشبیہات واستعارات، پیکر تراشی، صورت نگاری

اوروضع گری بھی بے پناہ ہے جس سے اردوادب کوکافی فائدہ پہنچایا ہے ۔

میری ہرغزل کی ہے آرزو تجھے سج سجا کے نکالتے
میرا فکر ہو تیرا آئینہ میرے نغمے ہوں تیرے پیرہن

فراق نے غزل، نظم اور رباعی سبھی کچھ کہا، لیکن رباعیاں اردوادب میں بہت مقبول ہوئیں۔ انہوں نے اپنی مجتہدانہ قوت سے شاعری کی نئی روش قائم کی۔ان کی غزلوں میں صرف تلذذ کی تلاش انصاف نہیں وہ تو حسن و عشق کی اداشناسی اور رمزآشنائی کے ساتھ تغیر پذیر زندگی کی آہٹوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ کائنات کوایک زندہ وجود تصور کرتے ہیں اور جنسی مادیت میں روحانیت کی کھوج کرتے ہیں۔ان کی جمالیاتی حس رعنائی و نزاکت سے پر ہے جس میں حدت اور تازگی بھی موجود ہے اور یقیناً ان تمام اوصاف نے ان کے لب ولہجہ پر نہایت موثر، خوشگوار، دوررس اور دیرپا اثر ڈالا ہے اور جیسا کہ ابھی میں نے لکھا ہے، ان کی آواز بڑی سے بڑے بھیڑ میں بھی کبھی گم نہیں ہوتی ہے، بلکہ اپنے لب ولہجہ کے صدقے دور سے پہچان لی جاتی ہے اور دیر تک کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے۔ ❁❁

مظفر حنفی کے افسانوی جہت (ص ۲۸ سے آگے)

بھانجہ ذہین ہے اس کی تعلیم کے لیے، میرے والدین ضعیف ہیں ان کی ضروریات کے لئے، میں ادیب ہوں اپنی عزت بنائے رکھنے کے لئے واقعی مجھے روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔'' (نقش فریادی،ص۱۶۳)

مجموعی طور پر پروفیسر مظفر حنفی کے افسانوں کی زبان نہایت رواں دواں اور پرکشش ہے۔الفاظ ان کی پوری گرفت میں ہیں اور زبان ان کے ذہن ودل کی غلامی کرتی نظر آتی ہے۔ زبان کی روانی وسادگی، الفاظ کا برمحل استعمال اور مناظر قدرت کا بیان ان کی تحریروں میں جادوئی رنگ بھر دیتا ہے۔ بہت سی ایسی اصطلاحیں جو عام طور پر مستعمل نہیں ہیں، انہیں بھی نہایت خوبصورتی سے استعمال کرکے مظفر حنفی نے ان کی بدولت حسن پیدا کر لئے ہیں۔

مظفر حنفی نے سماج کے ہر روشن وتاریک گوشوں کو بے نقاب کیا اور زندگی کو جیسا پایا کم وکاست ویسا ہی بیان کر دیا۔انہوں نے اپنے افسانے کا خام مال زندگی سے لیا اور افسانے کا جامہ پہنایا اور سماج کے سامنے رکھ کر اسے آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے جو ایک ادیب کا فرض ہے۔

دو دہائیوں تک اپنے قرب وجوار کے دیہی اور شہری اطراف کے مسائل، حسین وقبیح اور احتجاجی منظروں سے افسانوں کے تانے بانے بننے والے مظفر حنفی نے اگرچہ بعد میں اپنی تخلیقی بصیرت کے اظہار کے لیے افسانہ نگاری سے چشم پوشی اختیار کر لی۔ تاہم ان کے افسانے غضب کی تعمیری صلاحیت کا ثبوت ہیں۔ ان کا فن غیر محسوس طور پر ان کے افسانوں میں کام کرتا ہے۔کہیں بھی تصنع اور بناوٹ کا گمان نہیں ہوتا۔ بلاشبہ مظفر حنفی افسانوی ادب میں ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے اور اپنی اہمیت منواتے رہیں گے اور ہر عصر میں ان کے افسانوں کی فکری و فنی جہتیں روشن رہیں گی۔ ❁❁

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان و ادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے،اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔ آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسااوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ازراہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔شکریہ!

جمیلہ بی بی
Deptt. of Urdu, Banaras Hindu University, Varanasi

قمر رئیس کی ناول فہمی: خواتین کرداروں کی روشنی میں

ہندوستانی سماج قدیم زمانے سے ہی مرداساس سماج رہا ہے، جہاں مردوں کو بالادستی حاصل رہی ہے اور عورتوں کے حقوق کی پامالی ہوتی رہی ہے جس کے اثرات شعروادب میں بھی واضح طور پر نمایاں ہیں۔ اگر ہم قصے کہانیوں کی بات کریں تو اس میں بھی مرد کرداروں کے برعکس عورت کے کردار کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے اور ہر جگہ اس کو مردوں پر منحصر دکھایا گیا ہے، ان کہانیوں میں اگر چہ خواتین کردار کئی شکل میں ہوتے ہیں، لیکن کہانی کی ہیروئن کو ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ خاص طور سے پیش کیا جاتا ہے اور بڑی حد تک اس کو اہمیت بھی دی جاتی ہے، مگر یہ اہمیت نسوانی خوبیوں تک ہی محدود ہوتی ہے۔ وہ حسن و عشق کی زیبائش کرتی نظر آتی ہے، سیرت و تعلیم میں ماہر فن ہوتی ہے، اس کے سینے میں ممتا کا دل ہے، وہ ہر کام بڑی خوش اسلوبی سے کر سکتی ہے البتہ ان سب خصوصیات کے باوجود اس کے اندر سماج اور اپنے حالات سے لڑنے کی طاقت نہیں ہوتی ہے۔ وہ آہ و بکا تو کر سکتی ہے، لیکن اپنے اوپر ہو رہے مظالم کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتی ہے۔ یہ کام تو صرف کہانی کا ہیرو ہی کر سکتا ہے، اگر نسوانی کرداروں میں کوئی جنبش نظر آتی ہے تو وہ ہیروئن کی رقیب میں ہوتی ہے، یہ بات ماضی کی تھی پھر وقت کے ساتھ ساتھ انسانی تبدیلی اور جمہوریت کے نظام نے اردو ناولوں میں ہیروئن کے کردار کو بھی بدل دیا۔ اب اس کے اندر قوت و عمل اور حرکت و احتجاج نظر آنے لگا۔

کوئی بھی زبان ترقی کے مرحلے تک تب تک نہیں پہنچ سکتی، جب تک اس کی خامیوں کو منظر عام پر نہ لایا جائے اور اس کو دور کرنے کے راستے نہ بتائے جائیں۔ ادب میں یہ کام ایک ناقد ہی کر سکتا ہے۔ یہی وہ شخص ہوتا ہے جو ادب کو اس کا اصلی چہرہ دکھاتا ہے اور کھرے کھوٹے کی پرکھ بتاتا ہے۔ ایسے بلند نظر ناقدین میں پروفیسر قمر رئیس کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں جو بھی قصے کہانیاں لکھی گئیں اور خاص کر ناولوں کی شکل میں جو ادب سامنے آیا، ان کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے اردو ناول کی ہیروئن کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو ناول کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور میں ہیروئن کے بدلتے ہوئے تصور کو واضح کیا ہے۔

پہلے دور میں ان ناولوں کا ذکر ہے جن میں ہیروئن کا کردار ایک مثالی آدرش وادی بن کر رہ گیا ہے۔ دوسروں کے لئے تو وہ سب کچھ کر سکتی ہے، لیکن اپنے لئے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر سماج اور وقت کا سامنا کرنے کی قوت نہیں ہوتی ہے۔ وہ محض ایک کٹھ پتلی دکھائی دیتی ہے۔ قمر رئیس اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قدیم رزمیہ قصوں سے داستانوں تک افسانوی ادب میں ہیرو نے مرکزی اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔ رزم و بزم کے معرکے ہوں، اقتدار اور عیاری کے فتنے ہوں یا عشق بلا خیز کے مرحلے، ہر میدان میں ہیرو ہی مہمات سر کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے فعال اور متحرک کردار کے گرد ہی قصہ کا تار پود تیار ہوتا ہے۔'' (تعبیر و تحلیل، پروفیسر قمر رئیس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص۵)

اس طرح ہیروئن صرف ایک ذریعہ ہوتی ہے جو ہیرو کی طاقت کو بڑھاتی ہے اور سماج میں برتری حاصل کرنے میں اس کی مدد کرتی ہے، مگر یہ سب بھی اسے اپنے دائرے میں رہ کر کرنا پڑتا ہے۔ اگر واقعی میں کوئی عورت کھل کر مقابلہ کرتی ہے تو وہ ہیروئن کی رقیب ہوتی ہے، جس کے اندر ہمت اور بہادری ہوتی ہے، لیکن بالآخر اسے بھی پستی نصیب ہوتی ہے۔

اگر ہم قمر رئیس کے مطابق اردو ناولوں کی بات کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ پہلے دور کے ناولوں کی ہیروئن میں اگر چہ سبھی خوبیاں موجود ہیں،

مگر اس کے باوجود بھی وہ کچھ نہیں کر سکتی ،اس کی یہ ساری خوبیاں محض تماشہ بن کر رہ گئی ہیں۔اس کی مثالوں کے لئے ''مرأۃ العروس'' کی اصغری ''فسانہ آزاد'' کی حسن آرا ''فردوس بریں'' کی زمرد ''ابن الوقت'' کی فرخندہ ''چوگان ہستی'' کی صوفیہ کے کردار کو خاص طور سے پیش کیا گیا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نذیر احمد کے ناول ''مرأۃ العروس'' میں اصغری کا کردار ایک مثالی کردار ہے،یہی وجہ ہے کے اس کے بعد جتنے بھی افسانے یا ناول لکھے گئے وہ سب اصغری کے ہی رول ماڈل میں لکھے گئے ہیں ۔قمر رئیس نے ان سب کا ذمہ دار اس وقت کے سماج اور حالات کو بتایا ہے،جو سامنتی اور جاگیر دارانہ نظام پر قائم تھا جس میں عورت محض ایک آرام وآسائش کا سامان مانی جاتی تھی۔

دوسرے دور کے ناولوں میں ہیروئن کے کردار کو کچھ حد تک اہمیت حاصل ہو گئی ہے ۔شاید یہ اہمیت سماج میں آئی تبدیلیوں کی وجہ سے ممکن ہو سکی ہو،اب ناول کی ہیروئن اپنے اوپر کئے جارہے مظالم اور اپنے درد وغم کا اظہار خود کر سکتی ہے اور کچھ حد تک اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے،لیکن اب بھی وہ ان سب کے خلاف آواز اٹھانے میں ناکام ثابت رہی ہے۔ان ناولوں میں ''ایامی'' کی آزادی بیگم، پریم چند کی نرملا، رسوا کی امراؤ جان،علیم مسرور کے ناول ''بہت دیر کردی'' کی سلطانہ،عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کی نور جہاں، کرشن چندر کے ''شکست'' کی ونتی، بیدی کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' کی رانو، قرۃ العین حیدر کے ''اگلے جنم موھے بیٹیا نہ کیجو'' کی رشک قمر اور عصمت چغتائی کے ناول ''معصومہ'' کی نیلوفر قابل ذکر ہے۔ان ناولوں میں ایک بیوہ اور طوائف کے کردار کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ یہ دونوں ہی اپنی اپنی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی ہیں اور پر عذاب زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔دونوں کو ہی عشق کی چاہت ہے جسے وہ نہیں پا سکتیں لیکن اس کا اظہار ضرور کر سکتی ہیں۔کم سے کم اس دور کی ہیروئن اپنے زخموں اور غموں کو لوگوں کے سامنے رکھ تو سکتی ہے علاج بھلے ہی ممکن نہ ہو۔

اس طرح زمانے کی دوڑ اور ترقی نے جہاں سماج کے ہر فرد کی اہمیت کو جتانا شروع کیا وہیں اس نے ایک عورت کے رول کو بھی اہمیت دلائی اور اب ادب میں بھی اس کے خیالات کی عکاسی ہونے لگی۔مرد اور عورت دونوں کو برابری کا مقام دیا جانے لگا۔قمر رئیس نے اس کی وجہ مغرب کی صنعتی ترقی کو مانا ہے جس کے اثرات دھیمے دھیمے ہمارے سماج پر پڑ رہے ہیں۔یہ اثرات بھلے ہی ہیروئن کو کم نمائی کے دائرے میں پیش کرتے ہوں،لیکن اسی کم نمائی میں بھی اس کی انفرادیت اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''اس حقیقت کے باوجود نذیر احمد سے قرۃ العین حیدر تک اردو ناول کی ہیروئن کے روپ میں ہندوستانی عورت کے بدلتے ہوئے روپ اس کے مسائل ،سماجی حیثیت اور انسانی حقوق کے لئے اس کی انتھک جدوجہد کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔اردو ناول کے ارتقائی عمل میں ہیروئن کا تصور بھی ارتقا پذیر رہا، جب کہ داستانوں میں اس ارتقا کی نشاندہی مشکل ہے ۔اردو ناول کی ہیروئن اپنے ماحول اور معاشرے سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہیرو کے مقابلے میں اس کی سرگرمیوں کی سمت ورفتار محدود ہے۔اس کی خواہشوں کا حصار تنگ ہے اور اس میں ہیرو جیسی توانائی بھی نہیں۔ اس کا ایک فائدہ بھی ہوا کہ ہیرو کے فکر وعمل میں اگر اجتماعیت کا عنصر غالب ہے تو ہیروئن اپنی کم نمائی کے دائرے میں زیادہ انفرادیت اور دلکشی کی حامل نظر آتی ہے۔اس کا تعلق متوسط طبقہ سے ہو یا گاؤں کی کھردری زندگی سے، وہ شہر کے اعلیٰ طبقہ کی پرشکوہ زندگی کی نمائندگی کرتی ہو یا محنت کش عوام کی صفوں سے آئی ہو،اس کا تعلق ارباب نشاط کے بالاخونوں سے ہو یا فلمی نگارخانوں سے ،اس کے وجود کی دلکشی اور پہچان زیادہ تیکھی رہتی ہے۔ وہ اپنے باطنی محرکات،اپنے ماحول،اپنی جڑوں اپنی روایات اور قدروں سے زیادہ مانوس اور وابستہ نظر آتی ہے۔''
>
> (تعبیر وتحلیل،ص ۳۶)

ناول کے تیسرے دور کی ہیروئن اپنے ساتھ ہو رہے جبر وظلم کا سامنا بڑی بہادری سے کرتی ہے۔وہ ان کے خلاف آواز بھی اٹھاتی ہے اور اپنے

حق کو حاصل کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوتی ہے۔اس دور کے ناولوں میں پریم چند کے ''بازارحسن'' کی سمن، ''گئودان'' کی دھنیا، قاضی عبدالغفار کے ناول ''لیلیٰ کے خطوط'' کی لیلیٰ،عصمت کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن، قرۃالعین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ ''سیتا ہرن'' کی سیتا کے کردار کو خاص طور سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ان کرداروں میں جوش وحرکت بھی پائی جاتی ہے اور سماج سے لڑنے کی ہمت بھی ہے۔اب وہ اپنے دکھ ودرد کا مداوا خود کرسکتی ہے اور اپنا حق چھین بھی سکتی ہے۔''لیلیٰ کے خطوط'' کی لیلیٰ سماج کے ٹھیکیداروں کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے کہتی ہے:

''ہندوستان میں اور غالباً تمام ایشیا میں عورت مرد کے تفوق کے خلاف ایسی خوفناک بغاوت کرنے والی ہے جو تمہاری خودساختہ سوسائٹی کے شیرازہ کو درہم برہم کر دے گی......ہماری آئندہ کی نسلیں عورتوں کو مردوں کے تخت شاہی پر قبضہ کرتے دیکھیں گی اور ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لیا جائے گا......مجھ جیسی بازار میں بیٹھنے والی عورتیں جو سب سے زیادہ زخم نصیب ہیں اور سب سے زیادہ مظلوم، وہی انشااللہ باغیوں کی سب سے پہلی صف میں کھڑی ہوکر اور اپنے نیزوں کی نوک تمہارے سینوں پر رکھ کر تم سے کہیں گی 'لاؤ جو کچھ تم نے ہم سے' گزشتہ صدیوں میں چھینا ہے۔اس خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دو جو تم نے بہایا ہے۔مٹے ہوئے ارمانوں،ٹوٹی ہوئی امیدوں، زخمی دلوں، بگاڑے ہوئے نصیبوں کی قیمت ادا کرو' ایک ایک زخم گن لو جو تم نے لگائے تھے سب ہرے ہیں۔'' (تعبیر وتحلیل،ص۴۲وص۴۳)

بغاوت کی یہ آواز صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے خلاف وہ سماج کو بھی للکارتی ہے اور اپنے حق وانصاف کی مانگ بھی کرتی ہے،لیکن ان سب کے باوجود اب بھی کہیں نہ کہیں وہ اپنی حسرتوں کو دبائے ہوئے ہے اور اس کی یہ حسرتیں کبھی کبھی اس پژمردہ سماج کی سیاست کی بھینٹ بھی چڑھ جاتی ہیں۔قرۃالعین حیدر کا ناول ''سیتا ہرن'' کی سیتا کے بارے میں انتظار حسین کا کہنا ہے کہ:

''رام کی سیتا کو جب ہرن کیا گیا تھا تب اسے آسمانوں نے بھی صدائیں دی تھیں یا وہ آسمانی صداؤں کو سن سکتی تھی، لیکن ماڈرن سیتا کو اب کون سی زمین اپنی طرف کھینچے؟ وہ ریشم کی نظر نہ آنے والی بیری تو سیاست کی آتشیں قینچی سے کب کی کاٹ دی گئی ہے؟'' (تعبیر وتحلیل،ص۴۶)

ڈاکٹر خالد اشرف اس کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تا ہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرشن چندر،عصمت چغتائی،عزیز احمد اور بیدی کے نسوانی کردار آخر میں مردانہ سماج سے شکست کیوں اٹھاتے ہیں؟اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سبھی ناول نگار رومان پرست اور انقلابی فکر کے مالک ہوتے ہوئے بھی نہایت سنجیدہ حقیقت نگار ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ مشرقی سماج ابھی معاشی وفکری ترقیات کے اس موڑ پر نہیں آیا ہے کہ عورتوں کو مکمل آزادی عطا کر سکے،اسی لئے ان کے اکثر کردار بغاوت کرتے ہیں لیکن مردانہ سماج کے تحکم کے آگے ناکام رہتے ہیں،کیوں کہ آج اکیسویں صدی کی ابتدا کے باوجود برصغیر ہندوپاک میں عورت کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔'' (بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب،عتیق اللہ،ص۲۴۸)

ان سب خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اگرچہ ہندوستانی ادیبوں کے علاوہ سرحد پار کے اہل قلم مثلاً عبداللہ حسین، انور سجاد، خدیجہ مستور، سائرہ ہاشمی، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، اشفاق احمد،ممتاز مفتی،قدرت اللہ شہاب وغیرہ بھی ہیروئن کو وہ مقام دلانے کے حق میں نظر آتے ہیں جو انھیں ملنے چاہئے،لیکن ہندوستان میں قمر رئیس ہی وہ اہم شخص ہیں جنھوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ادب کے ان کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جن پر بہت کم لوگوں کی نظر پہنچتی ہے اور اسے واضح طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے انہوں نے ادب اور سماج کو ایک ساتھ جوڑ کر دکھایا ہے۔ ❀❀

افسانے

پروفیسر اسلم جمشید پوری

HOD, Urdu, CCS University,Meerut (Mob.09456259850)

فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

’’ساری دنیا کے سمندر ،ندی ، دریا، نالے اور پانی کے سارے منبع ومخرج اگر روشنائی بن جائیں، دنیا کے سارے درخت، پیڑ، پودے قلم بن جائیں اور میرے رب کی تعریف لکھیں تو روشنائی کم پڑ جائے ،قلم ختم ہو جائیں،لیکن میرے رب ،میرے اللہ کی تعریف پوری نہیں ہوگی......‘‘ فقیر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھ پر بہت اثر ہوا تھا۔دراصل میں کوڑیا پل پر پھٹے حال فقیر کے پاس سے اکثر گزرا کرتا تھا۔وہ فقیر اکثر عجیب حالت میں ملتا۔کسی موسم کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔اس کے پاس جو کمبل تھا،وہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔کرتا اور تہبند کا تو حال ہی برا تھا۔وہ شاید مہینوں سے نہایا نہیں تھا۔اس میں سے بدبو بھی آتی ،مگر مجھے اس کے پاس بیٹھنا،اس کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔وہ کبھی کھڑا ہو جاتا،کبھی اکڑوں بیٹھ جاتا تو کبھی پیر پھیلا کر لیٹ جاتا۔میں نے اسے نیا کمبل، کرتا اور تہبند لا کر دیا،تو اس کا غصہ دیکھنے لائق تھا۔آنکھیں سرخ ہو گئیں، چہرے کی رنگت دیکھ کر میں ڈر گیا۔اس نے میرے لائے ہوئے کپڑے پھینک دیے اور بڑبڑاتے ہوئے کوڑیا پل سے دور چلا گیا۔میں کانپ کر رہ گیا۔

مجھے فکر ہوئی کہ بابا کہیں ہمیشہ کے لئے گم نہ ہو جائیں۔ان کا جلال دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔میں عجب کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ ان کپڑوں کا کیا کروں؟ واپس لے جاؤں؟ یا یہیں چھوڑ دوں۔میں نے ہمت کر کے کپڑوں کو اٹھایا اور بابا کے سامان کے پاس ہی تہہ کر کے رکھ دیے اور بوجھل قدموں گھر واپس آ گیا۔

دوسرے دن جب میں وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں بابا سوئے ہوئے ہیں اور ان کے جسم پر میرا لایا ہوا کمبل بے ترتیب پڑا ہے،ٹانگیں کمبل سے باہر تھیں،ایک ہاتھ بھی باہر تھا،نیا کرتہ اور تہبند کمر کے نیچے پڑے تھے۔بے ترتیب داڑھی کے بال اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔میں نے قریب جا کر پکارا۔

’’بابا......بابا......‘‘

بابا ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔مجھ پر ایک سرسری نظر ڈالی، پھر آسمان کی طرف دیکھا اور زور زور سے بولے:

’’اللہ رحمٰن ہے ،اس نے انسان کو ایک ٹھیکرے کی طرح کھنکاتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا، جنات کو آگ سے پیدا کیا۔اس نے انسان کو بولنا سکھایا۔اس نے قران کی تعلیم دی۔سورج، چاند،ستارے درخت سب اس کے حکم کے تابع ہیں اور اسی کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔اس نے ترازو قائم کی، تا کہ تم ٹھیک ٹھیک تولو اور انصاف کرو۔اس نے مخلوقات کے لئے زمین وآسمان بنائے، پھل، پھول، میوے، کھجور اور بھوسے والا غلہ پیدا کیا۔وہ دونوں مغربوں اور مشرقوں کا مالک ہے۔اسی نے دریا اور سمندر بنائے ،جن میں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔اسی کے حکم سے دو سمندر آپس میں اس طرح ملتے ہیں کہ دونوں کا پانی اپنی الگ شناخت رکھتا ہے،اسی کے حکم سے سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں۔‘‘ وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہو گئے تھے۔میں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا۔میں نے دیکھا بابا سجدے میں گر گئے تھے۔اور زور زور سے پڑھ رہے تھے:

’’فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ......‘‘

’’فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ......‘‘

بابا کو سر جھکائے بہت دیر ہو گئی تھی۔میں نے ہمت کر کے انہیں پکارا۔

’’بابا......بابا......‘‘

مگر کوئی جواب آیا، نہ بابا کے جسم میں کوئی حرکت ہوئی۔میں گھبرا گیا اور واپس ہو لیا۔میں گھر آ گیا تھا،مگر میرے ذہن میں بابا کی باتیں اور حرکات وسکنات فلم کی طرح چل رہی تھیں۔

میں مرزا عارف دہلی کے جہانگیر پوری علاقے میں رہتا

ہوں اور پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے پاس واقع دہلی پبلک لائبریری میں ملازمت کرتا ہوں۔ روزانہ آفس جاتے ہوئے مجھے مختلف بسوں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ کئی بار کوڑیا پل سے بھی آنا جانا پڑتا ہے۔

کوڑیا پل بھی عجیب ہے۔ دنیا بھر کے فقیر یہاں گزر بسر کرتے ہیں۔ کالی پیلی صورت والے فقیر۔ کسی کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی، کسی کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے، کسی کی بیوی اپاہج، کسی کے پورے جسم پر کوڑھ، کوئی کانا تو کوئی اندھا، ہر مذہب کے فقیر، کیا عورتیں اور کیا مرد۔ کوئی جڑی بوٹیاں بیچتی عورت، کوئی پتھر بیچتا ہوا، کسی کے ہاتھ میں چھوٹی ڈائریاں، کوئی ریڈیو، کیسٹ بیچتا، کوئی ٹوپی اور رومال فروخت کرتا ہوا، کوئی بھگوان رام، شنکر، کرشن اور ہنومان کی مورتیاں اور فریم کی ہوئی تصویریں بیچتا ہوا، بھیک مانگتے مرد عورت۔ میرا وہاں سے گزرنا مشکل ہو جاتا۔ اصلی اور نقلی میں امتیاز کرنا ٹیڑھی کھیر تھا۔

اِسی کوڑیا پل پر میں نے بابا کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بھیک نہیں مانگ رہے تھے۔ چپ چاپ بیٹھے ایک طرف کو دیکھتے رہتے۔ کبھی بائیں، کبھی دائیں تو کبھی آسمان کی طرف دیکھتے رہتے اور اپنے آپ میں بڑبڑاتے رہتے۔ ان کی بڑبڑاہٹ میں صرف ''فبای......'' سنائی پڑتا۔ انہیں اپنے بدن کا بالکل بھی خیال نہیں تھا۔ کپڑوں پر میل کی تہیں، جسم گرد وغبار سے کالا کھسٹ، بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی، جسم پر اِدھر اُدھر سفید بالوں کا جماوڑہ، جسم سے اُٹھتی ہوئی بدبو۔ پہلے پہل تو میں ناک پر رومال رکھ کر نکل گیا، مگر دوسرے دن جب میں کوڑیا پل سے گزرنے لگا تو میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی:

''حق اللہ......حق اللہ......''

میں نے آواز کی طرف قدم بڑھائے تو دیکھا وہی بابا آسمان کی طرف دیکھ کر زور زور سے حق اللہ کی گردان کر رہے تھے۔ میں بدبو کی فکر نہ کرتے ہوئے، ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان کی آواز کا لطف لینے لگا۔ ان کی آواز میں ایک درد تھا۔ وہ جب رکے تو میں نے اپنی بیوی کی صحت کے لئے دعا کرنے کو کہا، مگر ان کی حرکات وسکنات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ''لا الہ الا اللہ'' پڑھنا شروع کر دیا۔ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کے، آفس آ گیا۔ میرا کئی دن اُدھر جانا نہیں ہوا، مگر جس بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اور ان کا عقیدت مند بنا دیا وہ یہ کہ میری بیوی بالکل صحت مند ہو گئی تھی، جب کہ ڈاکٹر نے پتھری کے آپریشن کے لئے کہہ دیا تھا۔

دہلی پبلک لائبریری، پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے ہے۔ بس ایک بڑی سڑک ہے جو دونوں کے درمیان حائل ہے۔ سڑک پر مغرب کی طرف چلنے پر ایک ٹی پوائنٹ آتا ہے، جس کے سیدھے ہاتھ کی طرف کچھ دور چلنے اور پل پار کرنے کے بعد موری گیٹ کا بڑا سا بازار ہے۔ آگے چل کر اُلٹے ہاتھ پر ایک میدان ہے جس میں عید بقرعید کی نماز بھی ہوتی ہے۔ ٹی پوائنٹ کے دوسری جانب یعنی الٹے ہاتھ کی طرف کچھ دور چلنے کے بعد شاہی فتح پوری کی عالیشان حوض والی مسجد ہے، جس کے اطراف میں ایشیا کا بڑا اور تاریخی صدر بازار ہے۔ سنا ہے یہاں میوے، کپڑے اور دیگر سامان کے ٹرک کے ٹرک لئے جا سکتے ہیں۔ دہلی پبلک لائبریری کی پشت پر چاندنی چوک کو جوڑنے والی تاریخی شاہراہ ہے جس کے ایک سرے پر لال قلعے کی عظیم الشان تاریخی عمارت ہے اور دوسرے سرے پر مسجد فتح پوری۔ درمیان میں چاندنی چوک کا دور تک پھیلا بازار۔ یہاں کا سوہن حلوہ اور کراچی حلوہ بہت مشہور ہے۔ سنہری مسجد، گردوارہ، اور بہت سے دَر، گلیاں، کوچے، کٹرے وغیرہ بھرے پڑے ہیں۔ پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے دو اخراج ہیں۔ ایک طرف مذکورہ علاقے، دوسری طرف کشمیری گیٹ کا گنجان علاقہ، اس سے آگے رٹز سینما کی شاندار عمارت، اس کے پیچھے آج کل دہلی اردو اکادمی کی بلڈنگ، سامنے آئی ایس بی ٹی کی بلڈنگ، بسوں کے لئے قیام گاہ اور میٹرو کا پل اور اسٹیشن۔

آج میں کافی دنوں کے بعد کوڑیا پل آیا تھا۔ بابا کی جگہ خالی تھی۔ مجھے حیرانی اور پریشانی تھی کہ بابا آخر کہاں گئے۔ آس پڑوس میں پتہ کیا، کسی نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ مایوس ہو کر میں اپنے آفس آ گیا۔ شام کو میں جب بابا کی جگہ پہنچا تو خالی جگہ میرا منھ چڑا رہی تھی۔

کئی دن تک بابا کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ ایک دن میں لائبریری کے کسی کام سے آر ایم ایس آفس گیا۔ مجھے وہاں سے ایک بلٹی کے بارے میں پتہ کرنا تھا۔ جوں ہی میں اپنا کام

کر کے آفس سے باہر آیا۔ایک کونے میں، میں نے دیکھا بابا سوئے ہوئے ہیں۔میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔میں لپک کے بابا کے پاس گیا۔بابا ہی تھے۔میلے کچیلے اور پھٹے کپڑوں میں ملبوس آدھا تہبند اٹھا ہوا۔بڑھے ہوئے بال۔میں نے دھیرے سے پکارا:

''بابا...... بابا......''

میری آواز پر آنکھیں کھول دیں۔لیٹے لیٹے ہی ''حق اللہ'' کہا۔میری طرف غور سے دیکھا اور پھر آسمان کی منھ کر کے زور زور سے بولنے لگے:

''وہ ایک ہے۔اس نے جنت اور جہنم بنائی ہے۔اس نے جنت میں نیک لوگوں کے لئے نہریں بہائیں،طرح طرح کے میوے، کھجور اور انگور لگائے،ایسی حوریں پیدا کیں،جیسے تہہ کیا ہوا موتی۔کسی انسان نے آج تک ان کو چھوا نہیں۔وہاں وہ جو خواہش کریں گے، پوری ہوگی۔ان سے کم درجے کے نیک انسانوں کے لئے بھی ایسی جنتیں ہوں گی جن میں وہ گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔پانی کے چشمے اُبلتے ہوں گے۔وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔بد اعمال لوگوں کے لئے اس نے جہنم بنائی،جس میں زقوم کا درخت ہے۔دہکتی ہوئی آگ ہے۔وہی باقی رہنے والا ہے۔باقی سب کو فنا ہونا ہے۔

فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ......''

''کھوں کھوں...... آ...... چ...... چھیں......''

انہیں پہلے کھانسی پھر زور کی چھینک آئی۔میں پاس سے پانی لینے دوڑا۔بابا پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ایک چائے والے سے پانی لے کر میں لوٹا تو بابا کو وہاں نہیں پایا۔میں نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھا:

''آپ نے بابا کو دیکھا...... ابھی یہیں تو تھے۔''

''نہیں...... ہم نے نہیں دیکھا۔''

میں مایوس ہو کر چائے والے کو گلاس دے کر اپنے آفس آ گیا۔اُداسی میرے اندر تک اُتر گئی تھی۔رات دن،سفر میں، آفس میں، میں بابا ہی کو یاد کرتا رہتا۔میں کوڑیا پل، پلیٹ فارمس،فٹ پاتھ...... ہر جگہ بابا کو تلاشتا رہا،لیکن بابا کی بجائے مایوسی ہی میرا مقدر بنی۔

وقت گزرتا گیا۔سال یوں گزرتے گئے گویا وقت نامی پرندہ تیزی سے محو پرواز ہو۔جہانگیر پوری میں حالات بہتر نہیں تھے۔

آخر ایک دن...... بھیانک فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔سینکڑوں دکانیں نذر آتش کر دی گئیں۔جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہوا۔

میرے بھانجے ریاض کی دکان بھی اس کی چپیٹ میں آ گئی۔دو تین بعد بلڈوزر آ گیا۔لوگوں کے ہجوم، آہوں، کراہوں اور چیخوں کے درمیان بلڈوزر دکانیں ڈھانے اور توڑنے لگا۔رونے اور چلانے والوں کی آہ و بکا میں بڑا درد تھا۔اچانک لوگوں نے دیکھا کہ پھٹے حال شخص،جس کے تن پر برائے نام کپڑے تھے،بلڈوزر کے سامنے لیٹ گیا،پھر کیا تھا ایک مقامی خاتون عورت بلڈوزر پر چڑھ گئی،پھر تو سینکڑوں لوگوں نے بلڈوزر بالکل چلنے نہیں دیا۔

''ماما...... میری دکان بچ گئی۔اس سے قبل کہ بلڈوزر دکان تک آتا،ایک فقیر بلڈوزر کے سامنے لیٹ گیا اور پھر لوگوں کو ہمت ہوئی اور یکے بعد دیگرے سب نے بلڈوزر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ماما میری دکان بچ گئی۔دوسری دوکانیں بھی بچ گئیں،اس فقیر کی وجہ سے......''

''ریاض کیا حلیہ تھا اس فقیر کا......''

''ریاض بتاؤ......''

میری اضطراری کیفیت دیکھتے ہوئے ریاض بولا:

''پھٹے حال، بے ترتیب بال، بڑھی ہوئی داڑھی...... کپڑے بھی آدھے ادھورے...... وہ بس بڑبڑا رہے تھے۔فبای......''

میرا اشتیاق بڑھ گیا۔ہو نا ہو وہ بابا ہی ہوں۔میں نے ریاض کو اسکوٹر نکالنے کو کہا اور ہم دونوں بابا کی تلاش میں نکل پڑے۔دکانوں کے جلے ہوئے ملبے کے پاس، جہاں اب بھی بھیڑ تھی۔سب سے پوچھتے پھرے:

''بھیا آپ نے بابا کو دیکھا۔''

سب نے یہی بتایا کہ ان کی وجہ سے ہی بڑی تباہی بچ گئی۔کوئی کہتا کہ اس نے مسجد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔کوئی بتاتا کہ اس نے فلاں گلی میں گھستے ہوئے دیکھا تھا۔جتنے منھ تھے اتنے بیان تھے۔میں اور ریاض بابا کو ہر جگہ تلاش کرتے رہے۔کہاں کہاں نہیں کھوجا،مگر مایوسی اور نامرادی ہمارا منھ چڑھا رہی تھی۔مجھے یقین ہے کہ وہ وہی بابا تھے۔ ❁❁

ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری
Rithpur, Dist- Amravati - 444704 (Maharastra) (Mob.9403860486)

سادگی میں سمادھان

اس دن ستمبر کی تین تاریخ تھی۔ اتوار کا دن رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ امراوتی شہر میں بھی چہل پہل کم ہوتی جارہی تھی۔ کچھ علاقہ تو نیند کی آغوش میں سما گیا تھا،بس اکادکا راہگیر، موٹرکاریں اور بائیک شور مچاتی گزرتی تو ماحول کے سناٹے میں ارتعاش سا پیدا ہوجاتا، پھر چند لمحوں بعد وہی خاموشی اور سناٹا۔

دن بھر اپنے سارے کام نمٹا کر میں رات ساڑھے گیارہ بجے اپنے افرادخانہ کے ساتھ واپس ریتھ پور جانے کے لئے کار سے سفر کررہا تھا۔ ابھی ہم شہر ہی میں تھے۔ چونکہ میں ڈرائیور کی بازو والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کٹھورا ناکہ سے چاندور بازار جانے والی سڑک پر بائیں جانب مڑنا تھا۔ جیسے ہی کار مڑی، میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے نیچے روشنی میں چار لوگ بیٹھے باتیں کررہے ہیں۔ ان میں دوعورتیں اور دومرد تھے۔ ایک مرد کی عمر پچپن ساٹھ برس اور دوسرے کی عمر چالیس برس کے آس پاس تھی۔ اسی مناسبت سے پہلی عورت کی عمر پچاس برس اور دوسری کی عمر تیس برس سے کچھ زیادہ تھی۔

پلاسٹک کی پھاری زمین پر بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ہرے ہرے پتوں کی ڈالیاں تھیں۔ بازو میں ایک برتن میں پانی رکھا تھا۔

دراصل دوسرے دن پیر تھا۔ ساون مہینہ ہونے کی وجہ سے ہندو مذہب کو ماننے والے لوگ پیر کی صبح شنکر بھگوان کی مورتی اور پنڈ پر بیل (ایک پھل) کے پیڑ کے پتے چڑھا کر پوجا کرتے ہیں جوان کے عقیدے کے مطابق نہایت پنیہ اور ثواب کا کام ہے۔

شہر میں تو عموماً بیل پھل کے پیڑ ہوتے نہیں، اس لئے دور دراز کے گاؤں اور پہاڑی علاقوں کے لوگ جو محنت کش مزدور ہوتے ہیں جنگلوں اور پہاڑوں میں موجود بیل کے پیڑوں کی چھوٹی چھوٹی ڈالیاں پتوں کے ساتھ توڑ کر ایک روز پہلے ہی شہر کے چوراہوں، بازاروں، سڑک کے کنارے آمدورفت کے راستوں پر اپنی دوکانیں سجا لیتے ہیں۔ اتوار کے علاوہ دوسرے دن بھی پتے بیچنے کے لئے رات بھر شہر میں گزارنے کے انتظام سے آکر وہ سب شہر میں اپنی دوکان کی جگہ پر ہی قیام بھی کرتے ہیں۔ اس بیوپار سے انہیں بہت رقم تو نہیں ملتی، مگر گزارے کے لئے مزدوری سے دو پیسے زیادہ ہی مل جاتے ہیں، جوان کی زندگی میں راحت کا سامان ہوتے ہیں۔

ان چارلوگوں کو اس طرح اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے ان کی زندگی میں جھانکنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

میں نے ان کے قریب کار رکوالی، مجھے گاہک سمجھ کر دونوں مرد میری کار کے قریب آئے اور اپنے پیشہ ورانہ انداز سے بولنے لگے:

''بابوجی بیل کے پیڑ سے توڑ کر لائے ہیں۔ آج ہی لائے ہیں۔ بالکل تازہ تازہ اور ہرے ہرے ہیں...... کتنے دوں......؟''

مجھے ان پتوں کے رنگ اور تازگی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو ان کا اطمینان، سکون اور خوشی جاننا چاہتا تھا۔ میں نے کہا:

''مجھے پتے نہیں چاہئے ......صرف یہ بتاؤ تم کون ہو......؟ کہاں سے آئے ہو......؟ ایک ہی جگہ دوکانیں لگا کر اب رات کے ساڑھے گیارہ بجے یوں اطمینان اور سکون کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کررہے ہو......اور اب تو رات ہو چلی ہے۔ اب کون گاہک آئے گا۔''

''گاہک تو نہیں آئے گا، مگر پورے ایک مہینے سے برسات بھی نہیں، جس کی وجہ سے گرمی اور امس بہت بڑھ گئی ہے، اس لئے نیند بھی کہاں آئے گی۔ آپ لوگوں کا ٹھیک ہے۔ کولر، پنکھا اور وہ ٹھنڈی ہوا دینے والی مشین سے گرمی بھاگ جاتی ہے اور نیند آجاتی ہے۔ ہمارا تو ویسا نہیں ہے۔ زمین پر بچھی ہوئی یہی پھاری ہمارا بستر ہے اور بھگوان کی چلائی جانے والی ہوا ہمارا پنکھا اور کولر ہے۔ رات جب زیادہ ہونے لگتی

ہے۔تب گرمی خود بخود کم ہو جاتی ہے تو دو گھڑی آنکھ لگ جاتی ہے اور پھر ان پتوں کو موکاٹ (آوارہ) جانوروں سے بچانے کے لئے دیکھ بھال بھی تو کرنا ہے، اس لئے یونہی بیٹھ کر بات چیت کر رہے ہیں۔''

اس نے جیب سے تمباکو کی پڑیا نکالی۔ڈبی سے چونا نکالا، ہتھیلی پر ڈال کر اسے انگوٹھے سے مسلا تو اس نوجوان شخص کے سوا سب نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔نوجوان شخص نے اپنی جیب سے گٹکے کی پڑیا نکالی اور اسے پھاڑ کر سر اونچا کر کے پورا گٹکا منھ میں انڈیل لیا۔اس سے باتیں کرتے ہوئے شخص نے ایک بار زمین پر تھوکا اور باتوں کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا: ''بابو جی آپ کہاں جاؤ گے......؟ کتنی دور ہے؟''

میں نے اپنے گاؤں کا نام پتہ اور فاصلہ بتا کر اس سے پھر سوال کیا:

''تم بتاؤ......تم لوگ کہاں سے آئے ہو اور آپس میں تمہارا رشتہ یا تعلق کیا ہے۔''

اب درمیان میں وہ نوجوان شخص بولنے لگا: ''میں کھومئی مدھیہ پردیش سے اور یہ مارکنڈا مہاراشٹر سے آئے ہیں۔ یہ میری پتنی ہے اور وہ میری بہن ہے۔ یہ میرے جیجا جی ہیں۔''

''ہاں بابو جی یہ میرا چھوٹا بھائی ہے اور یہ میری نند ہے۔''

بڑی عمر کی عورت نے جواب دیا۔

ارے یہ کیوں نہیں کہتی کہ تم میری بھوجی ہو اور میں تمہاری۔ بابو جی ہماری بدل کی سادی ہے آٹا ساٹا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور وہ مرد بتانے لگا:

''بابو جی ہمارے گاؤں کے بیچ اسّی سے سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے اس لئے ہم کبھی کبھار ہی ایک دوسرے سے مل پاتے ہیں۔ یہ تہوار کا موقع ہے۔ سبھی کو بیل پتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سہر کے لوگ یہ بیل پتر کھوجنے کہاں جائیں گے، اس لئے ہم پہاڑ اور جنگلوں میں رہنے والے لوگ یہ پتے والی ڈالیاں توڑ کر لاتے ہیں اور بیچتے ہیں۔ ہمارے دونوں کٹمب آٹھ دس برس سے ہر سال یہ پتے لا کر اسی چوراہے پر دوکان لگاتے ہیں۔ ایک ساتھ بیچتے ہیں۔ اب اس میں کیا کم زیادہ کرنا۔ کیا تیرا کیا میرا...... ہے تو ہمارا ہی اس طرح چار پیسوں کی بکری ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے سے میل ملاقات بھی۔ ایک دوسرے کے سکھ دکھ بھی جان پڑتے ہیں۔ اب تو موبائل سے بھی حال حوال معلوم ہوتا رہتا ہے، پہلے تو سال میں ایک دو بار ہی ایسے تہواروں پر کچھ بیچنے کے لئے یہاں آ کر ہی ملاقات ہوتی تھی، مگر اب تو سال بھر میں چار بار آنا جانا ہوتا ہے۔ دسہرہ پر شمی کے پتے، سونا دیوالی پر تورن کے واسطے آم کے پتے۔ جھینڈو کے پھول، کچھ تہواروں پر جوار کے پودوں کی کھو پڑی۔ اس طرح کا سامان بک جاتا ہے۔''

''اچھا کھانا ہو گیا......؟''

''ہاں بابو جی ہم نے صبح گھر سے کھانا باندھ کر لایا تھا۔ کچھ دوپہر میں کھالیا۔ بچا ہوا ابھی رات میں کھالیا۔ کل صبح پتے بکنے کے بعد یہیں سے کچھ لے کر کھالیں گے۔ شام تک تو گھر ہی جانا ہے۔''

''اچھا......گھر سے کھانے کے لئے کیا کیا لائے تھے......''

''کچھ خاص نہیں بابو جی، جو گھر میں روز کھاتے ہیں وہی کچھ۔''

اب وہ کم عمر عورت بول پڑی:

''بھوجی نے مکئی کی روٹی، میں نے باجرے کی روٹی۔ ساتھ ہی چھاچھ میں پکا ہوا کھٹا بیسن۔ ہری مرچی اور لہسن کا ٹھیچہ پیاز کی ڈلی، نمک، امباڑے کی کھٹی، بھاجی اور بس۔'' ان کا یہ مینو سن کر مجھے میرے بچپن کی کتنی ہی یادیں تازہ ہوگئیں۔ یہ سارے لوازمات میں بچپن میں غربت کی زندگی میں چکھ چکا تھا۔

ہمارے گھر، ماں بھینس کا تازہ تازہ گاڑھا گاڑھا کچا دودھ اور اس میں چٹکی بھر نمک ڈال کر مٹی کی صحنک میں کھانے دیتیں۔ اس نمک والے دودھ اور چولہے کے دہکتے انگاروں میں سینکی ہوئی پھولی پھولی باجرے کی گرم روٹی کا ذائقہ کی زبان پر رینگنے لگا۔

''تمہارے بچے کہاں ہیں......؟''

''بھیا بھوجی کے بچے تو بڑے ہو گئے ہیں۔ کچھ کا بیاہ بھی ہو گیا ہے۔ ہمارا ایک بچہ اسکول جاتا ہے۔ وہ دادا، دادی کے پاس گاؤں میں ہے۔''

''یہ دو دن کیسے گزرے......؟''

''بہت اچھے آرام سے خوشی خوشی۔ کوئی کٹ کٹ نہ کوئی جھنجھٹ اور گاؤں میں مزدوری کے پیسوں سے کچھ زیادہ ہی مل گئے۔

(بقیہ ص ۴۷ پر)

سلیم سرفراز
Musaddi Mohalla, Asansol - 713325 (West Bengal) (Mob. 9378291891)

تین مشت خاک

میں تمام سفر بیگم پور کے متعلق ہی سوچتا رہا تھا۔اس گاؤں سے کتنی ہی معصوم اور سرسبز یادیں وابستہ تھیں جو ذہن کے نہاں خانے میں اس طرح محفوظ تھیں کہ ذرا سی حدت پاتے ہی متحرک ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ہمارا سارا سفر ہمارے ذہن میں ہی طے پاتا ہے اور ہمیشہ پیچھے کی جانب ہوتا ہے۔بیگم پور سے دہلی تک کا فاصلہ تیس گھنٹوں کا تھا،لیکن مجھے یہ فاصلہ طے کرنے میں تیس طویل برس لگ گئے تھے۔کبھی کبھی پل بھر کی مسافت میں بھی برسوں لگ جاتے ہیں اور انسان شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی وہاں نہیں پہنچ پاتا ہے، جہاں پہنچنا اس کی حیات کی تکمیل ہے۔

میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور میرے جسم کے مساموں میں اسی مٹی کی سگندھ بسی ہوئی تھی، وہ سگندھ جو آہنی کل کارخانوں کی دھویں بھری کثافت میں بھی معدوم نہیں ہوئی تھی۔

بیگم پور بھی دوسرے گاؤں کی طرح بیحد پرسکون اور پرفضا گاؤں تھا، چھوٹا سا گاؤں جہاں کے لوگوں کی ہم آہنگی اور بھائی چارگی ایک مشترکہ خاندان کا خاکہ پیش کرتی تھی۔ اس خاکے میں کتنے رنگ بکھرے ہوئے تھے،ساون کے دھلے دھلے آسمان پر قوس قزح کی مانند، جس میں ہر رنگ جدا ہوتا ہے، اس کی اپنی ایک انفرادی پہچان ہوتی ہے پھر بھی ان میں ایک گہری وابستگی ہوتی ہے،قربت ہوتی ہے۔ سرسبز کھیت، آموں کے باغیچے اور ان میں خوش نوا پرندوں کی چہک، پھول اور پھول جیسے جسموں کی مہک پورے گاؤں کی فضا میں ترنگ بھر دیتی تھی،رس گھول دیتی تھی۔

برسوں پہلے جب میں بہت ہی چھوٹا تھا، یہ گاؤں ہی میرے خوابوں کا جہاں تھا، ایسے خواب جو معصوم ذہن میں آسمان پر بدلیوں کی مختلف شکلوں کی طرح اپنے آپ بنتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔اسی گاؤں میں میرا چھوٹا سا گھر تھا جس میں میرا جفاکش اور شفیق باپ اور ممتا اور پیار سے لبریز میری ماں رہتی تھی۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ میرے ذہن کے آئینے میں کئی چہروں کے دھندلے دھندلے نقوش اُبھرے جو میرے بچپن کے ساتھی تھے اور جن سے میرا اس عمر کا رشتہ تھا جب دل گاؤں میں بہنے والے دریا کے پانی کی طرح صاف وشفاف تھا، اس میں مصلحت یا منافقت کی گرد نہیں گھلی تھی۔ شنو یعنی شاہنواز، راجکمار عرف راجو، گل دین، بلّو اور رتنا جانے کتنے نام ذہن میں ابھرنے والے چہروں پر ثبت ہوتے گئے اور ان کی شناخت مستند ہوتی گئی۔شنو اور راجو میرے کتنے پیارے دوست تھے ہم ہمیشہ ساتھ ہی رہتے جہاں بھی جاتے ساتھ ہی جاتے۔

مجھے یاد آیا کہ ایک دن ہم تینوں دریا کے کنارے سیپیاں چننے چلے گئے تھے۔ کنارے پر بچھی نم آلود ٹھنڈی ریت پر ننگے پیروں چلنا اتنا فرحت بخش اور سرور انگیز معلوم ہوا کہ ہم سیپیوں کو بھول کر ریت پر بھاگنے لگے، اچانک نہ جانے کیسے میرا پاؤں پھسلا تھا اور میں اچانک ہی پانی میں گر پڑا تھا۔

مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ میں نے پانی کے جسم پر ہاتھ پاؤں مارے تو جیسے غصے میں وہ مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا تھا اور میں بیساختہ چیخ اٹھا تھا۔شنو اور راجو اضطراری حالت میں پانی میں گھس آئے تھے۔اس وقت انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بھی تیرنا نہیں جانتے ہیں۔

وہ دونوں کسی طرح مجھے کھینچ کر کنارے پر لائے تھے اور ریت پر لٹا دیا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی بات پر بھی میں نے ان کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے کوئی احسان جتایا تھا جیسے یہ سب ان پر فرض اور قرض تھا۔

ہم سب ایک ساتھ ہی گاؤں کے مدرسے میں داخل ہوئے تھے، جہاں دبلے پتلے اور نرم دل مولوی دین محمد نے ہمیں ابتدائی تعلیم دی

تھی۔ میں نے انہیں کبھی کسی پر خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی اتنے پیار اور شفقت سے سمجھاتے تھے کہ غلطی کرنے والا ندامت سے گڑ جاتا۔ مدرسے سے فارغ ہو کر کچھ لڑکوں نے اسکول میں داخلہ لے لیا تھا اور کچھ کھیت کھلیانوں میں اپنے باپ بھائی کا ہاتھ بٹانے لگے تھے۔ اسکول جانے والوں میں میرے ساتھ شنو اور راجو بھی شامل تھے۔

ہمارے گاؤں میں عید، محرم، ہولی اور دیوالی مشترکہ تہوار تھے۔ پورا گاؤں ان تہواروں میں شامل ہوتا تھا۔ دیوالی کے موقع پر میری ماں میرے لیے بھی ایک چھوٹا سا گھروندا بناتی اور اس پر رنگ و روغن چڑھا کر مٹی کے کھلونوں سے سجا دیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دیپوں سے سارے گاؤں کے ساتھ ہمارا گھر بھی جگمگ کرتا اور میں گھر گھر کھوئی اور بتاشے بانٹتا پھرتا تھا۔ اسی طرح محرم کے جلوس میں راجو بھی تعزیئے کے ساتھ ''یاحسین، یاحسین'' کے نعرے بلند کرتا ہوا چلتا اور سبیل لگا کر شربت تقسیم کرتا تھا۔

وقت گزرتا رہا، پھر ہم کچھ اور بڑے ہو گئے، ہماری مسیں بھیگنے لگیں اور ہماری آنکھوں میں سنہرے خواب تیرنے لگے کہ میری ملاقات زیبا سے ہو گئی۔ نہیں! ملاقات تو پہلے بھی ہوتی تھی، لیکن ان ملاقاتوں میں کوئی لطیف جذبہ کارفرما نہیں رہتا تھا جس طرح گاؤں کی دوسری لڑکیاں ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھیں بے ضرر اور بے سبب ہنسی مذاق ہوتا تھا، اسی طرح زیبا بھی ان میں شامل رہتی تھی، لیکن اس ملاقات کے بعد تو ہماری زندگی ہی بدل گئی تھی۔

موسم برسات ختم ہونے کو تھا۔ اس وقت میں گاؤں کے باہر ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا، جہاں روزانہ سائیکل سے آتا جاتا تھا۔ حسب معمول اس روز بھی اسکول سے گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں بارش نے آلیا۔ بارش سے بچنے کی خاطر میں نے ایک درخت کے نیچے پناہ لے لی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کوئی لڑکی بارش میں بھینگی ہوئی تیز قدموں سے آتی دکھائی دی۔ قریب آنے پر پہچانا کہ زیبا ہے۔

''اری زیبا! یہ بھینگی ہوئی کہاں سے آ رہی ہو؟''

میری آواز سن کر وہ چونک پڑی اور پھر درخت کے نیچے چلی آئی:

''پھوپھی کے گھر سے......وہاں آج ہلدی کی رسم تھی نا......''

وہ بھیگے ہوئے دوپٹے کو ہاتھوں سے نچوڑتے ہوئے بولی:

''لیکن بھیگنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہیں رک گئی ہوتی۔''

''میں چلی تھی تو آسمان بالکل صاف تھا اب مجھے کیا پتہ کہ راستے میں بادل میری تاک میں بیٹھا ہے۔''

اس کی بات پر میں بیساختہ ہنس پڑا۔ میں نے اسے دیکھا وہ پانی سے شرابور ہو چکی تھی۔ اس کی گھنی زلفوں سے پانی کی بوندیں ٹپک ٹپک کر پیشانی سے ہوتی ہوئی چہرے پر پھیلتی جا رہی تھیں اور اس کا چہرہ بھیگ کر کنول کی طرح کھلتا جا رہا تھا۔

اس کی بھیگی ہوئی قمیص اس کے بدن سے چپک سی گئی تھی اور اس کے مبہم سے نشیب وفراز کچھ کچھ واضح ہو رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ کوئی بند کلی ہولے ہولے اپنی پنکھڑیاں کھول کر دزدیدہ نگاہوں سے فضا میں کسی انجانی شے کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں گہری محویت کے عالم میں اس کا یہ حسین اور دل آویز سراپا تکتا رہا جو مجھے ابھی ابھی اور پہلی بار دکھائی دیا تھا اور جب میری نظروں کی تمازت سے اس کا روم روم سلگنے لگا تو وہ گھبرا کر دوپٹے کو اپنے جسم کے گرد لپیٹنے لگی:

''کیا بات ہے؟ ایسے کیوں گھور رہے ہو؟''

''زیبا!'' میں نے بمشکل اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی

''تم......تم......'' لیکن الفاظ میرے حلق میں اٹک گئے:

''کیا ہے رضوان؟ کچھ کہتے کیوں نہیں؟''

اس کے اصرار پر مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل میں اٹھنے والے مدوجزر سے وہ واقف ہو گئی ہے اور بڑی شدت اور چاہت سے میرے جذبات کے اظہار کی منتظر ہے۔ اس کے چہرے کی تمام شوخی اور شرارت غائب ہو گئی تھی، اس کی پلکیں بوجھل ہو گئی تھیں اور نرم ونازک ہونٹ مرتعش تھے، وہ ہمہ تن گوش تھی میں اپنی تمام قوتوں اور حوصلوں کو مجتمع کرتے ہوئے بولا:

''زیبا......جانے کیوں آج تم بالکل مختلف سی دکھائی دے رہی ہو مختلف، لیکن بیحد خوبصورت، تمہارے اس نئے اور انوکھے روپ سے میں ابھی ابھی آشنا ہوا ہوں اور اس آشنائی کے بعد مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ تم تو بہت عرصے سے میرے دل کی دھڑکنوں میں سمائی ہوئی ہو،

میرے دل کے ہر ورق پر تمہارا ہی نام درج ہے۔''

اس کی نظریں جھک گئیں اور اس کا بھیگا ہوا چہرہ شرم وحیا سے سرخ پڑ گیا۔ وہ گم صم سی خاموش کھڑی رہی۔ میں نے امید کی کرن کو حسرت سے تکتے ہوئے پوچھا تھا:

''کیا تمہارے دل میں بھی میرے لیے......؟''

اس کی نگاہیں دیر تک اپنے پاؤں کے اس انگوٹھے پر جمی رہیں جو بلاوجہ گیلی مٹی کو کریدر ہا تھا، پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری:

''تم تو ہائی اسکول میں پڑھتے ہو رضوان کیا میرے دل کے جذبوں کو نہیں پڑھ سکتے؟''

''زیبا!......زیبا......''

میری رگ رگ میں خوشی کی تیز لہر تیر گئی اور میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچا اور تیز بارش میں ہی بھاگتی چلی گئی اور پھر ہم نے کتنے ہی لمحے ایک ساتھ گزارے تھے دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر اور ایک دوسرے کی نگاہوں میں کھو کر۔ اس کے قرب میں گزارا ہوا ہر لمحہ میری زیست کا حاصل تھا ان پر لطف لمحوں میں ہم نے کتنے ہی حسین خواب دیکھے، ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں، خوش آئند مستقبل کے خوبصورت محل تعمیر کئے، مگر یکلخت سب کچھ بکھر گیا۔

اچانک ایک حادثے میں میرے والد چل بسے تھے اور ہمارے گھر میں غموں کا ایک سیلاب گھس آیا تھا۔ اس الم ناک حادثے کی اطلاع پا کر دہلی میں رہنے والے میرے ماموں بھی آئے تھے۔ انہوں نے ہمارے غم میں برابر کی شرکت کی اور لوٹنے سے قبل امی پر دباؤ ڈالا کہ وہ ان کے ساتھ دہلی چلیں۔ امی نے پہلے تو پس و پیش کیا، لیکن جب انہوں نے دہلی جیسے بڑے شہر میں میری بہتر تعلیم و ترقی کی ضمانت دی تو وہ رضامند ہو گئیں۔ میرے دل میں زلزلہ سا اٹھا۔ میں اپنا گاؤں، اپنے ساتھی اور اپنی زیبا کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا، لیکن تمام ماحول اس قدر سوگوار اور غم آگیں تھا کہ مجھے انکار کی جرأت ہی نہیں ہوئی۔

ہمارے جانے سے ایک دن پہلے زیبا آئی تھی۔ امی اندر کمرے میں سامان باندھنے میں مصروف تھیں۔ اس کو سامنے پا کر میں شرمندہ اور پشیمان سا کھڑا رہ گیا۔ وہ خزاں رسیدہ پودے کی طرح کھڑی رہی اداس اور مضمحل سی، اس کی آنکھوں میں تیرتی غم کی پرچھائیاں دیکھ کر میں تڑپ اٹھا تھا۔

''زیبا! میں واپس آؤں گا۔ بہت جلد واپس آؤں گا۔''

اس نے کچھ نہیں کہا تھا، بس خاموش گم صم سی کھڑی مجھے تکتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شکایت کی کوئی پرت نہیں تھی، ناراضگی کا کوئی شائبہ نہیں تھا صرف ایک گہری اداسی کا سایہ تھا جو تمام چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے ہونٹ لرزتے رہے اور اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئی تھیں۔ یکا یک وہ پلٹی اور تیزی سے باہر چلی گئی تھی۔

مجھے لگا تھا کہ میرے دل میں کوئی چراغ بجھ گیا ہے اور ہر سو تیرگی پھیل گئی ہے اس نے کچھ کہا کیوں نہیں، کچھ گلہ ہی کرتی، مجھ پر ناراض ہی ہوتی، وہ تو اس طرح ملی جیسے آخری بار مل رہی ہو۔ اسے یقین کیوں نہیں ہوا کہ میں واپس آؤں گا بہت جلد......اور آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی واپسی کتنی مشکل ہوتی ہے۔ ماموں نے ہماری تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اور میرا سر جھکتا چلا گیا تھا اور جب تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے ایک اچھی سی سرکاری ملازمت دلا دی اور مجھے اپنی فرزندی میں لینے کا عندیہ ظاہر کیا تو اس وقت بھی میرا سر نہیں اٹھ سکا تھا۔

سلمٰی ایک وفا شعار اور سلیقہ مند شریک حیات ثابت ہوئی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کا نصب العین شوہر کی خوشنودی حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس نے اپنے وجود سے پھوٹتے محبت کے شیریں چشمے سے ہمہ وقت میری روح کو سیراب کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ میں ایک مطمئن اور مصروف زندگی گزارنے لگا تھا جس میں دو معصوم اور پیارے بچے بھی شامل ہو گئے تھے، لیکن کبھی کبھی ...... ہاں کبھی کبھی ہی، جب میں تنہا ہوتا تو یادوں کا مصور دل کے سفید خالی کینوس پر اس گاؤں کا پس منظر اُبھار دیتا۔ کچھ لوگوں کے خدوخال واضح کرتا پھر زرد رنگ سے دو بھیگی ہوئی آنکھیں نقش کرتا جو سونی رہ گزر کو تک رہی ہوتیں۔ یہ مناظر مجھے مضطرب کر دیتے اور وہ آنکھیں مقناطیس کی طرح میرے وجود کو کھینچنے لگتیں۔ میں ان کی جانب بڑھنے لگتا کہ یکلخت میرے قدم ٹھٹھک جاتے۔ میں وہاں کس لیے جاتا؟ کس طرح جاتا؟

اب میرا وہاں کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں، سب کچھ تو ماضی کے قبرستان میں دفن ہو چکا تھا۔ میں اپنے اضطراب، اپنی بیقراری کو جھٹک کر خود کو نوزائیدہ رشتوں اور دوستوں کے سپرد کردیتا۔

برسوں گزر گئے میں ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ سلمٰی نے رخت سفر باندھا اور آخری منزل کی طرف چل دی۔ دونوں بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر اور خوشگوار زندگی کی تلاش میں دور نکل گئے۔ مجھے اس طرح خالی خالی پا کر تنہائی چپکے سے میرے اندر سما گئی۔

وہ گاؤں جو نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا، وہ لوگ جو وقت کی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے اور وہ آنکھیں جو شہر کے گرد وغبار میں دھندلا گئی تھیں، انہیں ایک بار پھر اپنے ذہن میں متحرک اور روشن پا کر میں تڑپ اٹھا اور تب میں نے جانا کہ آدمی کچھ بھی فراموش نہیں کر پاتا بلکہ عمر بھر خود فراموشی کا ہی شکار رہتا ہے، خاص کر وہ لمحے تو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر سد راہ بن کر کھڑے ہو ہی جاتے ہیں جن سے عمر کے کسی حصے میں تھوڑی سی بھی جذباتی وابستگی رہی ہو، تھوڑا سا بھی لطیف تعلق رہا ہو۔

اپنی بے چینی اور بیقراری سے مجبور ہو کر آخر کار میں نے اس زمین پر جانے کا قصد کرلیا جہاں میری زندگی کا قیمتی حصہ گزرا تھا، جہاں وہ ساتھی موجود تھے جنہوں نے اس حصے میں دھنک رنگ بھرے تھے، جہاں میں نے کسی سے بہت جلد آنے کا وعدہ کیا تھا۔

بیگم پور اسٹیشن کے باہر آیا تو میرے قدموں میں ہلکی سی لرزش تھی اور دل کی دھڑکنوں میں بے اعتدالی۔

مجھے یاد آیا کہ ایسی ہی کیفیت سے میں اس وقت دوچار ہوا تھا جب بورڈ کے امتحان کا نتیجہ دیکھنے گیا تھا۔ یہ موسم خزاں کی سہ پہر تھی، ہوائیں ساکت تھیں اور بے برگ وثمر اشجار خاموش کھڑے تھے۔ فضا میں ایسی اُداسی گھلی ہوئی تھی جو صرف موسم خزاں کا خاصہ ہے اور جو صرف گاؤں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایک جوان سا تانگے والا میرے قریب آیا اور بولا:

''چلنا ہے بابو جی!''

''ہاں بھئی!''

میں نے ایک طویل سانس لی اور تانگے پر بیٹھتے ہوئے کہا:

''بیگم پور چلنا ہے۔''

''کس کے گھر جائیے گا؟''

اس نے پوچھا تو میں اپنے آپ میں چونک پڑا۔ ارے ہاں! اس گاؤں میں کہاں جاؤں گا میں؟ کس کے گھر؟ کیا کوئی گھر ایسا ہے جو میرا استقبال کرے؟ میں کوئی فیصلہ نہیں کرپایا تو افسردگی سے بولا:

''پہلے گاؤں تو چلو!''

اس نے تانگے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں ایک ایک گھر کو پہچانتا ہوں۔''

''اچھا......! تم وہیں رہتے ہو؟ کیا نام ہے تمہارا......؟ تمہارے والد کون ہیں؟''

''میرا نام راج کرن ہے بابو جی۔''

اس نے گھوڑے کو چابک کے اشارے سے کچھ اور تیز کرتے ہوئے کہا

''میں راج کمار کا بیٹا ہوں۔''

''کیا......؟''

میرے رگ وپے میں خوشی کی ایک بجلی سی کوند گئی:

''تم راجکمار کے بیٹے ہو؟ اس راجو کے تو نہیں جس کے باپ کا نام دھیرج کاکا ہے؟''

''ہاں! ہاں!!''

اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا:

''آپ میرے پتاجی کو جانتے ہیں؟ لیکن آپ تو شاید پہلی بار یہاں آئے ہیں۔''

میں نے اس کے کاندھے پر پیار سے اپنا ہاتھ رکھا:

''پہلی بار نہیں بیٹے، بہت عرصے کے بعد آنا ہوا ہے۔ میں تو یہیں پیدا ہوا...... پرورش پائی۔ راجو میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم میں بڑا پیار اور قربت تھی...... اب تو وہ بھی میری طرح بوڑھا ہو چکا ہوگا...... ہے نا؟ کیسا ہے وہ؟''

''جی وہ تو پانچ برس ہوئے، مر گئے۔''

مجھے لگا کہ میرے ہاتھوں میں پکڑی ہوئیں تمام خوش رنگ تتلیاں ایک

ایک کر کے اڑ گئی ہیں اور میں خالی ہاتھوں انہیں خلا میں گم ہوتے ہوئے حسرت سے تک رہا ہوں۔

راجو مر گیا...... پانچ برس پہلے......لیکن میرے لیے تو وہ ابھی ابھی، اسی وقت مرا تھا کچھ ہی پل قبل تو وہ زندہ تھا۔ میرے ذہن کی فضا میں اس کی خوشبو بکھر رہی تھی، اس کے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی، اس کے وجود کا لمس مل رہا تھا کہ اچانک، یکلخت سب کچھ ختم ہوگیا......وہ مر گیا تھا۔

تانگہ سپاٹ سڑک پر تیز رفتاری سے بھاگتا رہا، لیکن میرا وجود ساکت و جامد ہوگیا تھا۔ میں نے افسردگی سے آنکھیں بند کرلیں میری خواہش ہوئی کہ گاؤں کے اور لوگوں کے بارے میں جانکاری حاصل کروں شھنواز، گل دین اور زیبا کے بارے میں۔

میں نے آنکھیں کھول کر ہونٹ کھولنے کی کوشش کی کہ کسی انجان خدشے سے کانپ اٹھا اور میرے ہونٹ صرف کانپ کر رہ گئے۔ میں خالی الذہن ہوکر قرب و جوار میں پھیلے ہوئے ٹنڈ منڈ خزاں رسیدہ درختوں کے سلسلے کو تکنے لگا۔ اچانک میری نگاہ کی گرفت میں گاؤں کا قبرستان آیا۔ یہ قبرستان گاؤں سے باہر کچھ دوری پر واقع تھا اور گاؤں میں داخلہ سے قبل اس کے پاس سے گزرنا ضروری تھا۔ تانگہ جب قریب پہنچا تو جانے کس خیال کے تحت میں نے راج کرن کو رکنے کے لیے کہا۔ تانگہ روک کر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا:

''کچھ دیر یہیں ٹھہرو میں ذرا قبرستان سے ہوکر آتا ہوں۔''

تانگے سے اتر کر میں قبرستان میں داخل ہوگیا۔ اس قبرستان میں جسے میرے گاؤں کے لوگوں نے مر مر کر بسایا تھا۔ چاروں طرف ایک پر اسرار اور سوگوار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی زمین پر خشک زرد رنگ پتے بکھرے ہوئے تھے جن پر پاؤں رکھتے ہی ایسی آواز ابھرتی تھی جیسے کوئی کراہ اٹھا ہو۔

میں دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا ایک تازہ قبر کے پاس پہنچ گیا شاید یہ قبر آج ہی بنی تھی کیونکہ اس پر ڈالی گئی مٹی ابھی تک نرم اور بھربھری تھی اس پر کچھ تازہ سفید پھول بکھرے ہوئے تھے اور سرہانے مٹی میں دبی ہوئی اگربتی کی ڈھیر ساری تیلیوں کے نیچے بھوری راکھ ابھی بھی جمع تھی۔ میں نے اس قبر پر تین مشت مٹی ڈالی، فاتحہ پڑھا اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دعا ختم کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے سینے سے کوئی بوجھ اتر گیا ہے اور میں بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں۔ باہر نکلتے وقت میں بے حد پرسکون تھا۔ برسوں کا میرا اضطراب، میری بیقراری یکسر ختم ہوچکی تھی۔

قبرستان کے باہر راج کرن میرا منتظر تھا، مجھے آتا ہوا دیکھ کر اس نے اپنی سیٹ سنبھال لی اور چابک اٹھا کر گھوڑے کو بھگانے کے لیے تیار ہوگیا۔ میں تانگے پر بیٹھتے ہوئے بولا:

''چلو......واپس اسٹیشن کی طرف......!'' ❁❁

سادگی میں سمادھان (ص ۴۲ سے آگے)

ہم تو اتنے پر ہی سمادھانی ہیں۔ ان پیسوں سے بچوں کے لئے مٹھائی اور چھوٹا موٹا کھلونا بھی لے لیں گے اور باقی پیسوں سے گھر جندگی کا جروری سامان۔ بابو جی انسان کو چھوٹی سی جندگی کے لئے سکھ جو سمادھان سے ملتا ہے، جو مل جائے اسی میں تو سکھ مان لو تو سکھ ہی سکھ ہے۔ نہیں تو لالچ میں تو دکھ ہی دکھ ہے۔ بابو جی اب تو رات بھی آدھی ہوگئی ہے۔ آپ کو بھی دور جانا ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہمیں تو جاگنا ہی ہے۔ کوئی گلتی ہوئی تو ماف کر دینا۔ بھگوان آپ کو بھی سمادھان کی دولت دے، جو سکھ پراپتی کے لئے ہو۔''

ان سیدھے سادھے بھولے بھالے کم پڑھے لکھے لوگوں کی ان باتوں نے میرے دل کو بھی شانتی سمادھان اور سکھ کی لازوال دولت سے مالا مال کر دیا۔ یہ اونچی اونچی ایر کنڈیشن عمارتوں اور بنگلوں میں رہنے والے ہزاروں فکروں میں گھرے لوگوں کے لئے سادگی میں سمادھان اور سکھ پانے کا پیغام تھا۔ ❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

افتخار عظیم چاند

"Hasin Lodge" 1st Floor, Near Chhoti Masjid, Tarni Prasad Lane,
Patna - 800008 (Mob. 9504890054)

گناہوں کا کفارہ

طوفان میل طوفانی رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔ موسم بہت ہی خراب اور سرد تھا۔ دن بھر رُک رُک کر بارش ہوتی رہی تھی۔ وہ بھی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے ملاقات کرنے اور گھومنے پھرنے کی خاطر کلکتہ گیا تھا اور تقریباً دس بارہ دنوں تک وہاں رہ کر واپس پٹنہ لوٹ رہا تھا۔ اس کی ریزرویشن کوچ نمبر S-3 میں تھی جو انجن سے چار پانچ ڈبہ پیچھے تھی۔ انجن کے پیچھے مال والی بوگی تھی، اس کے پیچھے پوسٹل ڈپارٹمنٹ کی بوگی اور ان دونوں بوگیوں کے پیچھے یکے بعد دیگرے S-1، S-2، S-3 نمبر کی بوگی لگی تھی۔ اس طرح اس کی بوگی S-3 انجن سے پانچویں نمبر پر تھی۔

طوفان میل دو گھنٹے لیٹ چل رہی تھی اور وہ بنگال کو پیچھے چھوڑ کر بہار میں کافی تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی، لیکن ٹائم میک اَپ نہیں کر سکی تھی، کیونکہ موسم کی خرابی کے باعث پٹریاں بھیگی ہوئیں اور آس پاس کی گل نم تھی۔ اس وجہ کر گاڑی کبھی کبھی آہستہ چلنے لگتی اور کسی وقت تیز رفتار بھی پکڑ لیتی۔ انجن کا ڈرائیور کافی منجھا ہوا مشاق تھا اور ہوشیاری کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔

بڑھیا اسٹیشن پر چند منٹ رُکنے کے بعد ٹرین پھر تیزی سے دوڑنے لگی تھی۔ بیچ بیچ میں چھوٹا چھوٹا اسٹیشن آتا، جہاں میل اور اکسپریس ٹرین کا ٹھہراؤ نہیں تھا۔ طوفان میل کو مکامہ اسٹیشن پر رُکنا تھا، لیکن مکامہ اسٹیشن کو آنے میں ابھی نصف گھنٹہ کی دیر تھی۔ رات تاریک اور ڈراؤنی لگ رہی تھی اور اس پر سے یہ ستم کہ لگاتار بارش کے سبب ٹھنڈ بڑھ گئی تھی اور بے حد سرد ہوائیں مسافروں کو کپکپا رہی تھیں۔

اس وقت شب کے آٹھ بج چکے تھے۔ اچانک ٹرین تیزی سے بریک لگانے کے سبب شدید جھٹکا کھا کر رُک گئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ طوفان میل میں زبردست ڈاکہ پڑا تھا اور اس حلقے کے نامی گرامی ڈاکو جمن خاں نے، جس کے سر پر کئی ٹرین ڈکیتی، بینک لوٹ اور انگنت قتل کا الزام تھا اور اسے زندہ یا مردہ گرفتار کرانے والے کے لئے پانچ لاکھ روپے کا انعام حکومت کی طرف سے مقرر تھا، اپنے گروہ کے ساتھ ٹرین میں ڈاکا ڈالا تھا اور بھاری تباہی مچائی تھی۔

اس کے گروہ کے سارے ڈاکو پولیس کی خاکی وردی میں ملبوس تھے۔ اس نے سب سے پہلے انجن کے ڈرائیور کو یرغمال بنا کر گاڑی رکوائی تھی اور ڈرائیور کی مزاحمت کرنے پر اور اس کے گاڑی نہیں روکنے پر غصے میں آکر بےقصور ڈرائیور کا گولی مار کر قتل بھی کر دیا تھا۔

سبھی سلیپر کوچ میں ڈاکو سوار ہو گئے تھے اور لوٹ پاٹ مچا رہے تھے۔ کوچ نمبر S-3 میں ڈاکو جمن خاں خود سوار ہوا تھا اور سب سے پہلے اس نے مسافروں کو خوف زدہ کرنے کے لئے اپنی رائفل سے ہوا میں ایک فائر بھی کر دیا تھا۔ وہ کوچ کے اندر داخل ہو کر اپنی رائفل کافی ڈرے سہمے ہوئے مسافروں کے سینے پر رکھ دیتا اور اس کے ساتھی، لوگوں کے مال و اسباب ایک ایک کر کے لوٹنا شروع کر دیتے۔ اس طرح اُس نے تمام مسافروں کو پوری طرح لوٹ لیا تھا۔ آخر میں بوگی کے اندر کیبن نما کمپارٹمنٹ باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ ڈاکو جمن خاں نے زوروں سے کیبن کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن جب اندر سے دروازہ نہیں کھولا گیا تو اس نے اپنی رائفل کی گولی سے دروازے کی چٹخنی کو توڑ ڈالا اور کیبن کے اندر گھس گیا جس میں ایک شادی شدہ جوڑا سفر کر رہا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنی رائفل کی نال نوجوان مرد کے سینے سے لگا دیا اور عورت سے بولا:

''چپ چاپ اپنے تمام زیورات اُتار کر اور جتنے بھی قیمتی سامان ہیں اور ساتھ میں جتنی بھی نقد رقم ہے وہ ساری کی ساری میرے حوالے کر دو...... دیر بالکل مت کرو...... چلو جتنی جلد ہو، ساری چیزیں

نکال کردے دو۔''

وہ عورت بے حدنڈر، جری اور دلیر تھی،فوراً وہ بول اُٹھی:

''کون ہوتے ہوتم، ہماری چیزیں لینے والے......؟''

''ارے زیادہ بڑبڑ کرے گی، چپ چاپ ساری چیزیں فوراً میرے حوالے کر دے۔ کیا تم نے ڈاکو جمن خاں کا نام نہیں سنا ہے جس سے حکومت اور حکومت کے اعلیٰ پولیس افسران بھی خوف کھاتے ہیں۔سمجھی، چل جلدی کر، وقت بہت کم ہے اور اگلا اسٹیشن قریب ہے۔''

''نہیں حنا......ایسا مت کرنا......''

اس کا شوہر بدر بول پڑا۔

سنگ دل ڈاکو جمن خاں نے اپنی رائفل کی نال اس مرد کے سر سے سٹا دیا اور کہنے لگا:

''اب میں ایک سے دس تک گنتی گنوں گا۔ اگر میرے دس تک گننے سے پہلے ہی تم نے اپنے سارے زیورات، قیمتی سامان اور نقد روپے جسے اپنے ساتھ لے کر سفر کر رہی ہو، میرے سپرد نہیں کیا تو میں تمہارے شوہر کو گولی سے اُڑا دوں گا۔''

''تم غاصب ہو، دوسروں کے مال کو ہڑپنا چاہتے ہو، یہ بڑا گناہ ہے، اللہ سے ڈرو......!''

''عورت کی باتیں سن کر جمن خاں آگ بگولا ہو گیا اور اس نے ایک زوردار طمانچہ حنا کو لگا دیا۔طمانچے کی شدید چوٹ کھا کر وہ برتھ پر گر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس کا شوہر اپنا ہوش نہیں سنبھال سکا اور آپے سے باہر ہو کر ڈاکو جمن سے بھڑ گیا۔اسی وقت ڈاکو جمن خاں نے لبلبی دبادی اور گولی حنا کے شوہر بدر کی کھوپڑی توڑ کر دوسری طرف نکل گئی اور وہ وہیں پر سدا کے لئے ڈھیر ہو گیا۔اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کو اس طرح مرتے ہوئے دیکھ کر حنا سے برداشت نہیں ہو سکا اور اس نے آگے بڑھ کر ڈاکو جمن خاں کے ہاتھوں سے رائفل چھیننا چاہا۔اسی چھینا جھپٹی میں جمن کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور ایک کھلی کھڑکی سے باہر تاریکی میں گر گئی۔اب جمن خاں بے حد طیش میں آ گیا اور کہنے لگا:

''تو نے اپنی نظروں کے سامنے ہی اپنے شوہر کا انجام دیکھ لیا، اب خود اپنا بھی انجام دیکھ، میں اب تجھ کو اپنی مخالفت کرنے کی سزا دیتا ہوں۔''اور وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

ایک زور آور اور سنگ دل ڈاکو کے مقابلے میں ایک کمزور وابلہ عورت کر ہی کیا سکتی تھی، پھر بھی اس نے خود کو بچانا چاہا،لیکن جمن نے آگے بڑھ کر اس کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور اس کے سارے زیورات کو نوچنا شروع کیا۔اسی درمیان حنا غم والم میں ڈوبی ہوئی بول اُٹھی:

''تم سارے زیورات اور قیمتی چیزیں لے لو، لیکن میرے مانگ ٹیکے کو چھوڑ دو۔ یہ میرے مرحوم شوہر کے پیار کی نشانی ہے اور اس نے اپنے مانگ ٹیکے ہی سے میری مانگ کو سجایا تھا۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا، یہ مانگ ٹیکا تو میں لے کر ہی رہوں گا اور اس کے بدلے اپنے مانگ ٹیکے سے تیری مانگ بھر دوں گا۔''

''اللہ سے ڈرو......اور توبہ کرو......اُس کا قہر نازل ہوگا تو تم کہیں کے نہیں رہو گے۔ کیا تمہاری ماں، بہن اور بیوی نہیں ہے؟ جو تم دوسرے کی ماں، بہن اور بیوی کو بیوہ بناتے ہو، اس کے مال واسباب کو لوٹتے ہو۔اگر یہی باتیں تمہاری ماں، بہن یا بیوی کے ساتھ رونما ہوتیں تو تم پر کیا گزرتی، کبھی ایسا سوچا بھی ہے۔''لیکن ڈاکو جمن پر حد سے زیادہ جنون سوار تھا وہ آگے بڑھا اور حنا کے بلاؤز کو بالکل پھاڑ ڈالا۔اس نے زوروں کا قہقہہ لگایا اور آگے بول اُٹھا:

''اب میری طاقت دیکھ، دیکھتا ہوں کہ مجھ سے تجھ کو کون بچاتا ہے؟''اتنا کہہ کر وہ حنا کی طرف بڑھا،لیکن جب اس کی نظریں حنا کے برہنہ جسم پر پڑیں تو یکا یک ڈاکو جمن خاں کے قدم رُک گئے اور وہ ایک ٹک اسے دیکھتا ہی رہا۔

حنا کے پورے پیٹ اور سینے پر جلنے کے بڑے بڑے داغ نمایاں تھے جسے دیکھ کر ایک جابر وظالم ڈاکو کے قدم خود بخود رُک گئے تھے اور نظریں شرم کے بوجھ سے نیچے جھک گئیں تھیں۔ وہ کسی سوچ میں غرق تھا اور اس کی نگاہوں کے سامنے آج سے تقریباً بیس سال پہلے کا وہ واقعہ اور گم شدہ منظر چلا آیا جو آج بھی اسے اچھی طرح یاد تھا۔

اس کے بچپن کا زمانہ تھا۔اس وقت اس کی عمر صرف دس سال تھی۔اس سے ایک چھوٹی بہن تھی جس کی عمر تقریباً سات سال کی رہی ہوگی۔ بھائی بہنوں میں کافی پیار تھا اور وہ سب ایک دوسرے پر جان

دیتے تھے۔اس کی ماں سخت بیمار تھی۔

ایک دن کی بات ہے کہ چولہے پر گرم پانی کھول رہا تھا اور اس میں چاول گل رہا تھا۔ چاول پسانے کے لئے اس نے جیوں ہی دیگچی کو کپڑے سے پکڑ کر اُٹھایا، حد سے زیادہ گرم اور تپی ہوئی دیگچی اچانک اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

جلنے سے بچنے کے لئے وہ برق رفتاری سے چولہے کے پاس سے ہٹ گیا،لیکن اس کی بغل میں اس کی چھوٹی بہن بیٹھی ہوئی تھی اور وہ جلد بازی میں اسے وہاں سے ہٹانا بھول گیا تھا اور سارے گرم گرم چاول اور پانی اُلٹ کر اس کی چھوٹی بہن کے پیٹ اور سینے پر گر گئے تھے اور وہ بری طرح جل گئی تھی اور تکلیف کی زیادتی کے باعث زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

اس وقت وہ ایک چھوٹا بچہ تھا اور ناعقل بھی تھا،گھبراہٹ میں اس نے لوہے کی ایک چھوٹی بالٹی میں بھرا ہوا پانی اپنی بہن کے جسم پر ڈال دیا تھا۔ جلنے کے سبب اس کے پیٹ اور سینے میں بڑے بڑے آبلے پڑ گئے تھے۔اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی اور جلی ہوئی جگہوں پر بڑا بڑا بینڈج باندھ دیا گیا تھا۔

تین مہینے تک علاج ومعالجہ کے بعد اس کا زخم پورے طور پر بھر گیا تھا اور وہ پوری طرح شفایاب اور صحت مند ہوگئی تھی اور پہلے کی طرح چلنے پھرنے، دوڑنے اور کھیلنے لگی تھی۔ اللہ نے اس کی بہن کو نئی زندگی دی تھی،لیکن وہ خود کو موردِ الزام ٹھہراتا تھا اور اپنی چھوٹی بہن کو جلانے کا قصوروار گردانتا تھا اور آج بیس سال گزرنے کے بعد بھی اس نے اپنی بہن کو بیوہ بنادیا تھا اور سب سے بڑا گناہ یہ کرنے جارہا تھا کہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی سگی بہن کی آبرو کے درپے ہورہا تھا۔

حنا نے اس کو اس طرح گہرے سوچ وفکر میں غرق دیکھا تو طنزیہ آواز میں بول اُٹھی:

''اب کیا ہوگیا، کیا تم کو سانپ سونگھ گیا ہے؟ آگے بڑھو اور اپنے ہاتھوں سے اپنی ماں بہن کی عزت تارتار کردو۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا، بہن......!'' وہ زوروں سے چیخ اُٹھا۔

''کتنوں کا سہاگ اُجاڑ کر، کتنوں کو بدھوا بنا کر اور کتنوں کی عزت وآبرو میں بٹا لگا کر اب مجھ کو بہن بول رہے ہو؟''

''حنا......میں تمہارا وہی بدبخت، بدقسمت بڑا بھائی ہوں جو زمانے اور حالات کے ستم سے تنگ آ کر غلط راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا تھا اور نوجوانی میں بدلے کی آگ میں جل کر ایک قتل کرنے کا مرتکب ہوا تھا اور خونی بن گیا تھا۔جیل کی سزا کاٹ کر جب باہر آیا تو میں ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہوگیا اور ایک خونخوار ودہشت ناک ڈاکو بن گیا۔ جب ڈاکوؤں کے پہلے سردار کی موت ہوگئی تو گروہ کے دوسرے ڈاکوؤں نے مجھ کو اپنا سردار منتخب کرلیا۔'' چند ثانیہ کے لئے وہ رُکا پھر کہنے لگا:

''مجھ کو معاف کردو، بہن......!''

''اپنی گندی زبان سے بہن مت بولو، سمجھے تم......! تم سے بڑا پاپی اس دنیا میں دوسرا کوئی نہیں ہوگا۔ ڈوب مرو چلو بھر پانی میں۔''

''ہاں......! میں بہت بڑا پاپی ہوں اور میں قاتل بھی ہوں۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنے بہنوئی کا خون کیا ہے اور اپنی بہن کی مانگ کو اُجاڑ کر اسے بیوگی کا لبادہ اُڑھا دیا ہے۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں ہی اپنی سگی بہن کی عزت لوٹنی چاہی۔ اس کا خمیازہ مجھ کو بھگتنا پڑے گا اور اپنے پاپ کا پرایشچت کرنا ہوگا۔ میں اب اپنا منھ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ مجھ کو جینے کا کوئی حق نہیں۔''

اتنا کہہ کر اُس نے یکایک اپنی کمر کے اندر گولیوں سے بھری پیٹی سے پستول نکالا اور اپنی کنپٹی پر رکھ کر لبلبی دبادی۔ اب وہاں ایک ہی نہیں بلکہ دو دو لاشیں پڑی تھیں۔ ❁❁

خریداراور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

منظومات

جوہرنوری
Moh. Chaudhriyana, C.K. Road, Ara, Bhojpur - 802301 (Mob. 7488259731)

نعت پاک

صداقت کا لے کر پیام آ رہے ہیں
جہاں میں وہ عالی مقام آ رہے ہیں

مصیبت میں آزار میں رنج و غم میں
ہمارے وہ ہر وقت کام آ رہے ہیں

جہاں کفر و ظلمت کی کل تیرگی تھی
وہاں نور ہی نور اب پا رہے ہیں

فرشتے وہاں پر ہیں آنکھیں بچھائے
جہاں ان کا نقش قدم پا رہے ہیں

جہاں ہو رہی تھی بتوں کی پرستش
وہاں نامِ حق اب لئے جا رہے ہیں

ہر اک سمت جوہرؔ ہے جشن مسرت
جہاں میں وہ عالی مقام آرہے ہیں

❀❀❀

جلائی آپ نے جو شمع تھی ہدایت کی
بجھا سکی نہ ہوا اس کو کفر و ظلمت کی

سبق وہ آج بھی سب کے لئے ہے راہِ عمل
ہدایت اہل جہاں کو جو دی ہے وحدت کی

اذیتوں کے عوض آپ نے دعائیں دیں
مثال ملتی نہیں آپ کی مروت کی

مٹا دی کفر و ضلالت کی ساری تاریکی
طلوع ہوئی جو شمع آپ کی رسالت کی

وسیلہ آپ کا بخشش کا ہے قیامت میں
نہیں امید ہے کچھ تقویٰ اور عبادت کی

وہ سر بلند دو عالم میں ہوگیا جوہرؔ
در حبیب کی جس شخص نے زیارت کی

❀❀❀

نعتیہ اشعار

خلیفہ ہے اُس کا نبی مصطفیٰ — کہیا جس کوں ووں لیل ہور و الضحیٰ (قدرتیؔ)

معراج میں حضور جو مدعو خدا کے تھے — خلوت تھی اور کوئی وہاں میہماں نہ تھا (کشن پرشادشادؔ)

عشق احمد کے سوا باقی جو کچھ ہے ، ہیچ ہے — عالم فانی میں سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں (واصلؔ)

وہ رسول خاص خدا کے ہیں، وہ چراغ بزم ہدیٰ کے ہیں — وہ شفیع جرم وخطا کے ہیں، وہ سپہر لطف وعطا کے ہیں (ماکھن لال)

حب نبی ہے نعمت دارین تہنیتؔ — اِس کے سوا کسی کی تمنا نہ کیجئے (تہنیتؔ)

ڈاکٹر ریشاؔ قمر

H.No. 189, Near Mahindra, Showroom Sedam Road, Kalaburagi - 585105
(Karnataka) (Mob. 7259673569)

خاموشی

یہ خاموشی بھی دیکھو تو
انوکھی چیز لگتی ہے
بڑی دلچسپ ہوتی ہے
کبھی حیران کرتی ہے
پریشانی بھی دیتی ہے
کبھی چپکے سے یہ ساری حقیقت کھول دیتی ہے
اداؤں سے، خطاؤں سے، وفاؤں سے، جفاؤں سے
کبھی آنسو کے قطروں سے
کبھی آنکھوں کے حلقوں سے
کبھی انگلی کی حرکت سے
کبھی ہونٹوں کی جنبش سے
کبھی سب کچھ یہ کہتی ہے
زباں کی نوک سے لوگو
تمھیں بھی جاننا ہوگا
کہ خاموشی کی بھی اپنی زباں ہوتی ہے
اک ایسی
جسے کوئی سمجھتا ہے، جسے کوئی ہی پاتا ہے
جسے بس کوئی سنتا ہے
انوکھا ساز ہوتی ہے، عجب آواز ہوتی ہے

بڑی ہم راز ہوتی ہے
بڑی دَم ساز ہوتی ہے
یہ اک احساس ہوتی ہے
بڑا ادراک ہوتی ہے
بنا دستک دیے دل کے سبھی دَر کھول دیتی ہے
سرورِ عشق دیتی ہے
کوئی پتھر ہو، اُس کو بھی رلا دیتی ہے پل بھر میں
خموشی بھی
عجب شے ہے
نہ کہنا بھی حقیت میں
بہت کچھ کہنا ہوتا ہے
کبھی سوئے ضمیروں کو جگاتی ہے
کبھی یہ پیار کے نغمے سناتی ہے
خموشی شور و شر کو بھی دباتی ہے
یہ غصے اور نفرت کو جھکاتی ہے
خموشی سے بڑا دشمن بھی پل میں زیر ہوتا ہے
ریشاؔ جی خموشی کی زباں تو
ایسی ہوتی ہے

❀❀❀

بنگلہ : شمس الرحمٰن

اردو : نسیم عزیزی

172, G.T.Road, (South) Howrah - 711102 (West Bengal) (Mob. 8777329145)

کوئل کی پرسوز آواز قبرستان میں

کسے معلوم کتنے عرصہ بعد
سوندھی مٹی کے بطن سے ناگاہ
باہر آکر جو گرد و پیش اپنے
دیکھتا ہوں
میں کون ہوں، کیا ہوں؟
ایسے ویران سے مقام پہ گر
کوئی پوچھے
میں کون ہوں، کیا ہوں؟
اس سیہ رات کی فضاؤں میں
سینۂ خاک چاک کر کے میں
باہر آیا مگر، عجیب لگا
میری پہچان کھو گئی کب کی
کوئی منزل، نہ کوئی نام مرا
کون ہے جو بتائے نام و نشاں؟
گوشت سے بے نیاز میرا جسم
ہڈیوں کا فقط ہے اک ڈھانچہ
قبر سے اٹھ کے ہو گیا ہے کھڑا
شام کی نیم جان سی کرنیں
ہڈیوں کے پرانے ڈھانچے سے
دل لگی اور مذاق کی خاطر
بوسہ لیتی ہیں، جانے کتنی بار
گوشت سے خالی میرے بازو کو
گدگداتی ہیں، چھیڑ جاتی ہیں
یوں ہی بے سمت چلتا رہتا ہے
بے بس و نامراد سا ڈھانچہ
کتنا ویران ہے یہ قبرستان
اک کرشمہ ہے کوئی نامعلوم
جس کے دم پر یہ چلتا رہتا ہے
جسم سے لپٹی بھربھری مٹی
اک ذرا بھی کہیں نہیں گرتی
دفعتاً اُڑ کے آئے دو کوّے
بیٹھ جاتے ہیں میرے شانوں پر
چاہتے ہیں کہ پوری قوت سے
کائیں کائیں کریں، مگر یہ کیا؟
خامشی ان پہ طاری ہوتی ہے
اور پھر......
تین کوئلیں یک لخت
دُور، کچھ دُور مارے خوشیوں کے
نغمہ جاں فزا سناتی ہیں
کوئی دیکھے نہ دیکھے ڈھانچے کو
کوئلوں کی صدا تو روشن ہے
یوں تو میں نے ہزار کوشش کی
گلے میں اپنے بجلیوں کی کڑک
کر کے پیدا بس اپنے ہونے کا
کروں اعلان
وائے ناکامی!
بار بار اپنے حصے میں آئی
جسم کی ایک ایک ہڈی پھر
مثل برگِ شجر خزاؤں میں
جھڑنے لگتی ہے، گرنے لگتی ہے
آسماں پر ستاروں کی جھرمٹ
مجھ پہ ہنسنے میں ہے ابھی مصروف
اور ویران سا، یہ قبرستان!
گاہ گاہ اس کی خامشی کو وہ
درد میں ڈوبی کوئلوں کی صدا
ڈھل کے سنگیت کے سُروں میں، مگر
توڑتی رہتی ہے بہر لمحہ......

❀❀❀

اسدؔ رضوی

Mohammadpur, Mobarak, P.o. Ramna, Muzaffarpur - 842002
(Mob. 9934832981)

غزلیں

ستارے توڑ کے لانے کا یہ بہانہ کیا
ہمارے بچوں کا رونا کیا ، مسکرانا کیا
جو اعتبار کے قابل نہیں ہیں ان کے لئے
زمین چیز ہے کیا اور یہ زمانہ کیا
ہمارا کام ہے سچ بولنا تو بولیں گے
ہماری پشت پہ ظالم کا تازیانہ کیا
رقیب ہی سہی ان کو گلے لگا لیجئے
جو روٹھ جاتے ہیں اکثر انہیں منانا کیا
خدا کی راہ سے بہتر تو کوئی راہ نہیں
''کہیں تو لٹنا ہے پھر نقد جاں بچانا کیا''
یہ لوگ گھر کے پرندوں سے سیکھتے بھی نہیں
یہ چار دن کا ٹھکانہ اسے سجانا کیا
زمیں کے خود ہی مسائل ہیں لئے اسدؔ رضوی
زمیں کو چھوڑ کے اب آسماں پہ جانا کیا

❁❁❁

حادثے سارے اُتر جاتے ہیں ان کے سر سے
باوضو ہو کے نکلتے ہیں جو اپنے گھر سے
نہ کوئی جسم ہی سوکھے نہ کوئی لب ترسے
تیری قربت کی جو برسات نظر سے برسے
نہ کوئی پھول ، نہ خوشبو ، نہ تمنا پھر بھی
حاثے روٹھ کے جانے لگے میرے گھر سے
کیا عجب خوف مسلط ہے کہ اب شام ڈھلے
بند ہو جاتے ہیں دروازے دریچے ڈر سے
چومنے لگتے ہیں قدموں کو ستارے آکر
آسماں جب بھی گزرتا ہے ہمارے سر سے
اب تو دہلیز پہ وہ رسم چراغاں بھی نہیں
شام ہوتے ہیں بچھڑ جاتی ہیں آنکھیں در سے
سانحہ روز گزرتا ہے سر شام اسدؔ
اب کوئی آنکھ کسی غم میں کہاں تک برسے

❁❁❁

سخنوران دکن کے اشعار

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو
یاقوت ہور مرجان میں کوں ہے رتن برتر کہو (شاہیؔ)

اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں
دینے کو وصل کا پھل ، لینے کو جیو اتالی (نصرتیؔ)

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانا کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی (ہاشمیؔ)

اُس گل بدن کے غم میں رونا ہے عین حکمت
کرتی ہیں ضعیف دل پر آنکھیں گلاب پاشی (آصفؔ جاہ)

شہاب ظفؔر اعظمی

Deptt. of Urdu, Patna University, Patna

غزلیں

اک پری وش کا اعتبار کیا
زندگی صرفِ انتظار کیا

چند کانٹوں نے تھام کر دامن
مصحف گل کو خار خار کیا

ساری بستی کا وہ محافظ تھا
کل جسے ہم نے سنگسار کیا

دل بڑی مدتوں میں دھڑکا ہے
پھر کسی نے مجھے شمار کیا؟

گل کھلا کر حسین یادوں کے
موسم ہجر پُر بہار کیا

وہ ترے درد ہوں کہ حسرتِ دل
عمر بھر ہم نے ان سے پیار کیا

قدرِ اخلاص اور یہ دنیا؟
کیوں ظفؔر تم نے دل فگار کیا

❁❁❁

درد کو خوشبو ، آہ کو نغمہ ، داغ کو چندا لکھو
لکھنے والو لکھو تو ہر لفظ سنہرا لکھو

تم چاہو تو لکھ بھیجو ہر ایک شکایت ان کو
یاد رہے بس اتنا کوئی لفظ نہ چبھتا لکھو

روپ کا دریا جتنا تم نے اتھلا اتھلا پایا
پریم کا ساگر اتنا ہی ہے گہرا گہرا لکھو

مکر ، ریا اور حرص ہوس کی اس کھوٹی دنیا میں
مہر ، مروت ، عشق ، وفا کو کھوٹا سکہ لکھو

منزل منزل دُکھ کے طوفاں رستہ غم کی لہریں
میری مانو تو جیون کو آگ کا دریا لکھو

ماضی کی تاریخ ہوں میں اسلاف کا آئینہ ہوں
لکھنے والو میری سانسیں میرا چہرہ لکھو

تم نے اپنے پاؤں ظفؔر خود کلہاڑی ماری ہے
کتنا سمجھایا تھا کہ مت ایسا ویسا لکھو

❁❁❁

اشعار قدما

ہنس ہاتھ کو پکڑنا کیسا سحر ہے پیارے
پھونکا ہے تم نے منتر گویا کہ ہم کو چھو کر (آبرؔو)

کیا ہوا حاتؔم تجھے جینے سے اُکتایا ہے کیوں
دم غنیمت جان مشفق زندگانی پھر کہاں (حاتؔم)

چھوڑ کر اپنی تعلّی ، کر تواضع اختیار
رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے (ناسؔخ)

کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں
جانتا ہے خوب وہ مضموںؔ کو (مضموںؔ)

وارثؔ رفیع

51 Civil Lines, Near Raodways Bust Stop, Badaun - 243601
(Uttar Pradesh) (Mob. 88535067557)

غزلیں

خوشبو رسوا نہ ہو یہ رسم پرانی ہے بہت
گھر میں خوشبو کے لیے رات کی رانی ہے بہت

اچھا ماحول ہے اشجار ہیں پانی ہے بہت
کوچۂ غیر میں کیوں نقل مکانی ہے بہت

میرے ورثے میں بزرگوں کی نشانی ہے بہت
میرے اجداد کی کوٹھی یہ پرانی ہے بہت

اس کی تقریروں میں بھی جوش جوانی ہے بہت
حق وانصاف تو کم شعلہ بیانی ہے بہت

غم دوراں سے پریشاں ہیں سبھی پیر و جواں
جس سے پوچھو وہی کہتا ہے گرانی ہے بہت

ہم نے دیکھے ہیں زمانے میں بہت اہل سخن
اہل دانش کے یہاں فن میں روانی ہے بہت

میری غزلیں فقط الفاظ کا جادو ہی نہیں
میری غزلوں میں مرے غم کی کہانی ہے بہت

عہد جمہوریت میں جھوٹ ہے ارزاں وارثؔ
حق و انصاف صداقت کی گرانی ہے بہت

❁❁❁

اے خدا ایسی تو بادشاہی نہ دے
جسے اہمیت اک سپاہی نہ دے

دن بھی لگتا ہے جیسے کہ تاریک شب
بادلوں کو اب ایسی سیاہی نہ دے

جذبہ حق پرستی ہے تجھ میں اگر
زر کے لالچ میں جھوٹی گواہی نہ دے

حق جمہوریت میں رہے یہ خیال
شخص بد کو کبھی تخت شاہی نہ دے

حق پرستوں کے حق میں ہے بہتر یہی
منصفوں کو خدا کم نگاہی نہ دے

یہ گرانی کی افتاد کا ہے صلہ
دعوتوں میں کوئی مرغ و ماہی نہ دے

اپنی مخلوق پر تو کرم کر خدا
زلزلوں کی مسلسل تباہی نہ دے

منزلوں کا پتہ کیسے وارثؔ ملے
جب تلک نقش پا کوئی راہی نہ دے

❁❁❁

طلحہ تابش

Station Road, S.P.W. Pratapgarh - 230001 (Mob. 9044676517)

غزلیں

دل کا ہر ایک گوشہ مجلّٰی تھا دیر تک
اک شخص میری آنکھوں میں ٹھہرا تھا دیر تک

آنکھوں میں اس کے مکر تھا دل میں عناد تھا
پھر بھی وفا کا لب پہ سویرا تھا دیر تک

کیسے بھلا سکوں گا ابھی کل کی بات ہے
راہِ جنوں میں ، میں بھی اکیلا تھا دیر تک

کیا دن تھے خواہشوں میں سنورتی رہی حیات
مجھ پر تری نگاہ کا پہرہ تھا دیر تک

بستی ہمارے دل کی وہی کر گیا تباہ
دل کے مکاں میں آکے جو ٹھہرا تھا دیر تک

سچ ہے تمہارا ساتھ نہ پایا تھا جب تلک
راہوں میں زندگی کی اندھیرا تھا دیر تک

کس کس سے یہ بتائیں کہ تابشؔ مرا وجود
ہر ایک نظر میں کوئی تماشہ تھا دیر تک

❀❀❀

دل سے ایمان کی قوت نہیں جانے والی
ہم حسینی ہیں شجاعت نہیں جانے والی

صرف احکامِ الٰہی پہ چلا کرتی ہے
خود سے چل کے کہیں شہرت نہیں جانے والی

مجھ کو ترکے میں ملی ہے یہ محبت و خلوص
دل سے پرکھوں کی وراثت نہیں جانے والی

چڑھ کے سولی پہ دیا کرتے ہیں ہم درسِ حیات
کبھی ضائع یہ شہادت نہیں جانے والی

گرم پتھر پہ لٹاتے ہیں یہ ظالم لیکن
کبھی ایمان کی طاقت نہیں جانے والی

ظلم وہ لاکھ کریں کچھ نہیں ہونے والا
صبر اور ضبط کی قوت نہیں جانے والی

جس جگہ ٹھیس پہنچتی ہو انا کو تابشؔ
اس طرف میری طبیعت نہیں جانے والی

❀❀❀

پنج ابیات

اگر نئیں ہے عاشق چکور چاند کا
توں راتاں کوں وو کیا سبب جاگتا (وجہیؔ)

در وادیٔ حقیقت جس نے قدم ہے رکھا
اوّل قدم ہے اُس کا عشق مجاز کرنا (ولیؔ)

نکر مردم آزاری تجھے مرنا ہے سوں سارے
عذاباں قبر ہے بھاری تجھے بھی واں سمانا ہے (قادرؔ)

تم کو ہزار شرم سہی ، مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا (حالیؔ)

نشانِ سجدہ سجا سجا کر بہت غرور نہ کر
وہ نیتوں سے نتیجے نکال لیتا ہے (نامعلوم)

غزلیں

ڈاکٹر محمد ضمیر رضاؔ

Asstt. Prof. Deptt. of Urdu, P.G. Patna University
Patna - 800005

تری فرقت میں آنکھوں کو نہیں کچھ کام رہتا ہے
میں تنہا جب رہوں اس دم صراحی جام رہتا ہے

تمہارے بن مرے دل کا یہ کیسا حال ہے دیکھو
میں سو جاؤں مگر پھر بھی لبوں پر نام رہتا ہے

تڑپنا گر ہے قسمت میں تو منظور مقدر بھی
زمیں پر کچھ نہیں چلتا فلک کا کام رہتا ہے

سنہری یاد کو تم نے نہ جانے کب بھلا ڈالا
مجھے تو انتظار دید صبح و شام رہتا ہے

ارادہ ترک کر ڈالو مقدر کے سنورنے کا
سنا ہے اس کی زلفوں میں سنہرا دام رہتا ہے

رضاؔ یہ فلسفہ سمجھو محبت کے فسانے کا
شکستہ آئینہ جب تک نہ ہو تو خام رہتا ہے

❁❁❁

جبیںؔ نازاں

2nd Floor, Gali No.12, Near Abdullah Masjid,
Ramesh Park, Laxmi Nagar, New Delhi 110092
(Mob. 9801315572)

یار نے خوب دل لگی کی ہے
ہائے بے خواب زندگی کی ہے

نقل کی میں نے جب روایت دل
لوگ کہتے ہیں شاعری کی ہے

دوری لازم تھی ربط میں شاید
ایک دیوار سی کھڑی کی ہے

بیقراری سی ہر گھڑی دل میں
کیا علامت یہ عاشقی کی ہے

کون رہبر تھا ، کون رہزن ہے
مسخ پہچان اس صدی کی ہے

جو نمی سی ہے میری آنکھوں میں
بات ان کے لئے ہنسی کی ہے

ہر جگہ اختلاف ہوتا ہے
بات تھوڑی تناتنی کی ہے

❁❁❁

مطالع زیبا

ہم بانسری پہ موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی ، اے زندگی رتبہ رہے بالا ترا (خلیل الرحمٰن اعظمی)

تم آگ لگائے بیٹھے ہو، اب آگ بجھانا مشکل ہے
قسمت کا بگڑنا سہل سہی ، تقدیر بنانا مشکل ہے (نجم ردولوی)

دکھائی دیتا ہے یوں آفتاب شیشے میں
کہ جیسے تیرا رخ پر عتاب شیشے میں (عبدالحئی فائز)

ہیں اجنبی سے اپنے ہی جذبات اِن دنوں
ہوتی نہیں ہے خود سے ملاقات اِن دنوں (صباؔ نقوی)

سلطان مظفر آزاد

"Bazm-e-Noor" Chowdharan, Arrah, Bhojpur (Mob. 7301916565)

غزلیں

غزل کے نام پہ شکوے گلے ، خوشی آنسو
قلم اُٹھایا تو دل پر رہا نہیں قابو

وہ ایک نقرئی سکہ جو وار کر مجھ پر
عجب ادا سے مرے دل پہ کر گیا جادو

بھروسہ کرنا کسی پر بہت ہے نادانی
نہ جانے لوگوں میں کیسے لگی ہے یہ بدخو

شب فراق جب جام و سبو سے ٹکرایا
ترا ہی جلوہ نمایاں ہوا مجھے ہر سو

بہت اُداس ہے اس شہر کا حسیں منظر
نہ چین سے کوئی مُلّا نہ ہے کوئی سادھو

وفا کی راہ پہ تو چل پڑا تو ہے آزادؔ
مگر ہے راہ بہت پر خطر سمجھ لے تو

❁❁❁

زباں پہ تالا ہے آنکھوں پہ پردہ ڈالے ہے
یہ کیسی عشق کی مجبوریاں وہ پالے ہے

وہ شہر حسن کا طالب ہے اور زن کا مرید
فریب کا ہر اک آنکھوں میں دُھول ڈالے ہے

تپش یہ دُھوپ کی جھلسا نہ دے حسیں چہرہ
چھپائے چہرہ ہے سر پہ ڈوپٹہ ڈالے ہے

ہر اک سے پیار بھی کرتا ہے حق پرستی بھی
مگر وہ دل میں کدورت ہنوز پالے ہے

وہ مشکلوں میں بھی چاہت بھری نگاہوں سے
کوئی بھی سامنے آئے گلے لگا لے ہے

وہ جب بھی تذکرہ اوروں کا کرتا ہے آزادؔ
تو اپنے سامنے سے آئینہ ہٹا لے ہے

❁❁❁

مقاطع زیبا

کیا جانے اب کدھر کو گئے حیف اے نصیرؔ　یارانِ رفتگان کی نہیں کچھ خبر مجھے　(شاہ نصیرؔ)
اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے　ماؤں نے تیرے نام پہ بچوں کا نام رکھ لیا　(احمد فرازؔ)
سوچوں تو دردؔ بحر مسلسل ہے زندگی　دیکھوں تو اک سراب کے اندر سراب ہے　(دردؔ ہوشیار پوری)
آنکھ روشن ہے مگر دل نہیں روشن تو اثرؔ　کس طرح عالم امکاں سے پرے بھی دیکھوں　(اثرؔ انصاری)
رونے کے لئے میرے جنازے پہ اب عفتؔ　جز یاس و الم کوئی بھی غم خوار نہیں ہے　(عفتؔ)

خالدعبادی

C/o Book Emporium, Sabzibagh, Patna - 800004 (Mob. 9835480456)

رباعیاں

حسرت ہی رہی دل میں کبھی تو ملتا   ہر سمت نظر آتا ، بہ ہر سو ملتا
دیوانہ مجھے کہتے زمانے والے   ہونٹوں پہ مرے نعرۂ حق ہُو ملتا

❁❁❁

زنجیر کی آواز سنا دیتی ہے   دیوانگی دیوانہ بنا دیتی ہے
آنکھوں میں کوئی خواب نظر آتا ہے   تعبیر جھلک اپنی دکھا دیتی ہے

❁❁❁

گلشن میں کوئی پھول نہیں کھل سکتا   تو ڈھونڈنے والوں کو نہیں مل سکتا
جس دامن صد چاک کی ہے فکر تجھے   کانٹوں سے مری جان نہیں سل سکتا

❁❁❁

ہم لوگ سفر میں نہ حضر میں ٹھہرے   کچھ دیر تری راہ گزر میں ٹھہرے
ہم لوگوں کو حسرت سے فلک دیکھتا ہے   ہم لوگ ہی دشمن کی نظر میں ٹھہرے

❁❁❁

صحرا میں سمندر کی صدا سنتے ہیں   افلاک میں شہپر کی صدا سنتے ہیں
اندھے ہیں ، نظر آتی کہاں ہیں لہریں   گو جھیل میں پتھر کی صدا سنتے ہیں

❁❁❁

منظر کو بدلنا ہے ، بدلنا ہوگا   مدہوش جو ہیں ان کو سنبھلنا ہوگا
اشجار کے سائے میں ہو تم بیٹھے ہوئے   تم کو بھی کڑی دھوپ میں چلنا ہوگا

❁❁❁

طوفان اٹھا اور زمیں کانپ گئی   وہ گرد اُڑی اچھا برا ڈھانپ گئی
اے موت چل اب اپنا ارادہ تو بدل   نادان سہی زیست مگر بھانپ گئی

❁❁❁

یہ دشت یہ صحرا ، یہ چمن اپنا ہے   یہ روح ، یہ طاقت ، یہ بدن اپنا ہے
تم کون ہو اے اجنبی ، اے فتنہ طراز   یہ ملک ، یہ بستی ، یہ وطن اپنا ہے

❁❁❁

کتابوں کی دنیا

نام کتاب :	نہایت		
مصنف وناشر:	خالدؔ عبادی		
صفحات :	۱۱۲	قیمت :	۱۵۰روپے
مبصر :	**علی احمد فاطمی**		

خالد عبادیؔ ہمارے عہد کے عمدہ اور لائق مطالعہ شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات اردو کے بیشتر موقر رسائل کی زینت بنتی ہیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ میں شاعری کا سمجھدار قاری نہیں ہوں۔ فکشن اور تنقید کو زیادہ دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اب جب کہ انہوں نے اپنا یہ تازہ شعری مجموعہ عنایت کیا تو سب سے پہلے اس کے عنوان نے ہی چونکایا۔ اس سے زیادہ اس کی پیش کش نے اور اس سے بھی زیادہ ان کی شاعری نے متوجہ اور متاثر کیا۔

مجموعہ کا نام ہے ''نہایت'' جو بات نہایت اچھی لگی وہ یہ کہ دورِ حاضر میں شعری مجموعوں کی کثیر اشاعت سے یوں ہی اردو زبان و ادب کی گردن جھکی ہوئی ہے، پھر ان مجموعوں کے اندر کثرت سے نقادان اور پروفیسران کی بے سرپیر کی آرا نے ان کی کمر توڑ دی ہے۔ ایسی صورت میں ''نہایت'' مجھے نہایت اچھا لگا کہ وہ ان تمام آلودگیوں سے پاک ہے، اس سے شاعر کے اعتماد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پائے تخلیق اس قدر مضبوط ہیں کہ اسے کسی قسم کے سہارے اور بیساکھی کی ضرورت نہیں۔ تیسری بات بھی کہتا چلوں جو ذاتی قسم کی ضرور ہے، لیکن اچھی بات ہے، اس لئے اچھی بات کو ظاہر کرنا چاہئے تاکہ دوسرے اس پر عمل کر سکیں۔ جب میں نے شکریہ کے طور پر خالد عبادیؔ کو فون کیا تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ:

''اطمینان ہوا کہ آپ کو مل گیا، ورنہ لوگ حصولیابی کی اطلاع تک دینے کی زحمت نہیں کرتے۔''

بس اس کے علاوہ کچھ نہیں، کوئی دوسرا عام سا شاعر ہوتا تو کچھ لکھنے، تبصرہ کرنے کی فرمائش ضرور کرتا، لیکن خالد عبادیؔ نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ ایک شاعر کی یہ عزت نفسی مجھے اچھی لگی۔ ایک ذاتی بات اور مجھے اچھی لگی وہ یہ کہ مجموعہ کے پہلے ہی ورق پر لکھا ہوا تھا:

''بے ریا نقاد اور معاصر ادب کے سچے پارکھ علی احمد فاطمی کی نذر۔''

میں سچا پارکھ ہوں یا نہیں اس کا دعویٰ تو نہیں، لیکن بے ریا ضرور ہوں جس کا ثبوت یہ تبصرہ نما مضمون ہے کہ عبادی کی شاعری پر لکھ کر مجھے کوئی فائدہ یا اعزاز ملنے والا نہیں اور نہ انہیں کچھ ملنے والا۔ یہ میرا قلمی و ادبی فریضہ ہے کہ اپنے عہد کے سنجیدہ شاعروں، افسانہ نگاروں وغیرہ پر قلم اُٹھاؤں اور کسی حد تک تنقید کا حق ادا کروں جن سے کچھ ملنے کی امید ہوتی ہے، ان پر نہ کے برابر لکھتا ہوں کہ ان پر لکھنے والے بے شمار ہیں۔

مجموعہ ''نہایت'' صرف ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں چالیس غزلیں ہیں اور دس نثری نظمیں۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے اپنے تمام تر اختلافات و الزامات، الگاؤ اور بھٹکاؤ کے باوجود اردو شاعری پر اس کی حکمرانی کل بھی تھی اور آج بھی ہے، اس لئے کہ بقول رشید احمد صدیقی:

''غزل صنف سخن ہی نہیں معیارِ سخن بھی ہے۔''

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جو شاعر غزل نہیں کہہ سکتا، وہ عمدہ نظم اور نثری نظم بھی نہیں کہہ سکتا۔ غزل کے ممتاز و منفرد شاعر فراقؔ نے کہا تھا کہ:

''غزلیہ شاعری انتہاؤں کا سلسلہ ہے جہاں تغزل، تفکر، رومان و وجدان کے پر لگ جاتے ہیں اور وہ عالم وجد میں وجود میں آتی ہے۔''

انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ شاعری کا ہوجانا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس میں روحِ شاعری پیدا کرنا اور روحِ شاعری کا پیدا ہونا اتنا آسان نہیں، خاص طور پر ایک ایسے دور میں جب انسان کی اپنی روح بھٹک گئی ہو، صرف جسم ہی جسم ہو جو مادیت اور صارفیت کا شکار ہو چکا ہو۔ حرص و ہوس کا ایک بے ہنگم شور، جب کہ شاعری شانت آتما اور پرسکون ماحول کی

پیداوار ہوتی ہے جن میں شاعر کی کچھ آرزوئیں، تمنائیں اور کچھ خواب ہوتے ہیں جو اپنی نوکِ پلک سے شروع ہوکر وسعت فلک پر ختم ہوتے ہیں، جو اپنی ذات سے زیادہ کائنات پر نظر رکھتے ہیں، لیکن جب خواب تکمیل خواب کے بجائے شکست خواب میں بدل جائیں تو شاعر بیتاب ہوکر کہہ اٹھتا ہے ۔

خواب کوئی کیا دیکھے اس بے خوابی میں
چین نہیں مل پاتا ہے بے تابی میں

تو سوال اُٹھ سکتا ہے کہ آخر یہ بے خوابی اور بے تابی کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ انتشار روح کا ہے یا جسم کا۔ یہ رومانیت ہے یا مادیت، اس لئے کہ جس طرح کے بازار میں ہم کھڑے ہیں اور جس طرح آج کا انسان ساری آسانیوں کے باوجود بے یارومددگار ہے اس سے زیادہ شاعری۔

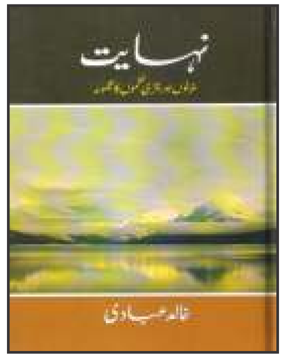

بے چہرگی اور بے چارگی کے ماحول میں سوال تو پیدا ہوتا ہی ہے کہ شاعر کہاں کھڑا ہے اور شاعری کہاں کھڑی ہے۔ اس کی آواز کیا ہے یا اسی شور کا حصہ بن گئی ہے، یا دورِ جدید کی حیرت زا اطلاعات کے آگے سرنگوں ہوگئی ہے، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ شاعری محض اطلاعات سے نہیں ہوتی اس کے لئے تو ایک خاص قسم کے گیان دھیان، تپسیا اور آگہی و عرفان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ دردمندی اور جذبے کے گداز پن کی، لیکن کبھی کبھی عہد کی ژولیدگی وفکر کی پیچیدگی باہم شیر وشکر ہوکر ایک نیا لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر اس میں فطری پن اور بے ساختگی ہو تو شاعری جدید بھی ہوگی اور غور طلب بھی۔ پہلی ہی غزل میں جو بے خوابی ہے، وہ دوسرے شعر میں کس طرح ڈھلتی ہے ۔

کچھ تو عالم امکاں میں ایسا ہوگا
حیرت ہی حیرت ہے جس کی یابی میں

شاعری میں عالم امکاں کا تصور تخلیقی وجدان کا ناگزیر اور قیمتی حصہ ہوا کرتا ہے جسے غالبؔ نے دشت امکاں کہا تھا۔ جہاں تحیر ورومان اس کی یافت ہے کہ شاعری کا یہ وجدانی عمل ہی زندگی کی رومانیت نیز حقیقت کے پردے سرکاتا ہے اور اس طرح کے شعر خلق ہوتے ہیں ۔

دنیا نے کیا جانے اس میں کیا دیکھا
میں نے اپنی جھلک دیکھی فارابی میں

شاعر کا وژن کچھ اور ہوتا ہے اور قاری کا کچھ اور، جوشؔ نے کہا تھا ع

تیری دنیا اور ہے شاعر کی دنیا اور

خالد عبّادی کی دنیا بھی کچھ اور ہے۔ امکان، اُڑان اور وجدان کی دنیا بھی اور جہاں اضطراب، مبہم ادراک میں ڈھل جاتا ہے، حقیقت بے نام احساس اور گفتار میں ارتعاش نظر آنے لگتا ہے، اس لئے کہ شاعری اکثر خوابوں میں بستی ہے۔ شاعری سرد آہوں سے سماج کی تعمیر ہوتی ہے، لیکن یہ لمحے ایک شاعر کی زندگی میں کبھی کبھی ہی آتے ہیں، اسی کو انگریزی شاعر کولرج نے "Best moments of best life" کہا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رومان و وجدان کی پرواز بھی وہیں تک جائے گی جہاں تک فنکار کا علم وشعور، مشاہدہ و تجربہ ہوگا۔ اس کے لئے شعورِ علم سے زیادہ شعور کائنات ضروری ہوا کرتا ہے جو جدید شاعروں کے یہاں کم نظر آتا ہے کہ شاعری اور کائنات کے درمیان ان کی ذات کا عمل دخل کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ذات کے نہاں خانوں میں اکثر سکوت اور اندھیرا ہی ہوتا ہے، اسی لئے اکثر کے یہاں روشنی کم، دھندلکا زیادہ ہوتا ہے۔ فلسفہ کم جذبہ زیادہ ہوتا ہے، لیکن اگر ذات اور کائنات کے درمیان فکر ونظر کی قندیل روشن ہے تو شاعری کا کینویس از خود نہ صرف روشن بلکہ بڑا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بغور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

خالد عبادیؔ کے ذہین شاعر ہونے میں شبہ نہیں، وہ دنیا کی بھی بات کرتے ہیں اور مقتل کی بھی، رقیب کی بھی اور اعدا کی بھی، دل کی دھڑکن ہے اور کوچہ خطر بھی، یہ ساری نازک اور باریک اصطلاحیں دوسری غزل میں مل جائیں گی، لیکن اسلوب اور لہجہ کی انفرادیت، اصطلاح اور انتشار کے درمیان اپنا ایک الگ راستہ منتخب کرتا دکھائی تو دیتا ہے، لیکن الگاؤ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں الجھاؤ کا بھی شائبہ نظر آنے لگتا ہے۔ اکثر سوچنے والے شاعر کے یہاں انتشار اور بکھراؤ ہوتا ہے کہ شاعری کو کسی فارمولے یا پہاڑے کی طرح نہیں لیا جاسکتا۔ یہ شاعری کی پریشاں فکری

اور انتشار ذہنی کا ہی اظہار ہوتی ہے، لیکن اسی انتشار اور بکھراؤ میں راستہ نظر آنے لگتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؂

جو خواب تم نے دیکھا تھا ناخواب ہوگیا
مقتل ہمارے خون میں غرقاب ہوگیا

بے حرفِ آرزو ہے بے تیغ معاش ہے
یوں بھی نہیں کہ سینۂ عالم خراش ہے

اس شہر بے ریا میں توطن نہ کر قیاس
جھپکی ذرا سی آنکھ مکر جائیں گے کئی

کس کی طرف لپکتی چلی جا رہی ہے خلق
یا خوابِ خوش مزار ہے یا بے مزار دھول

سرمدی ادا تیری پا مردی صلہ تیرا
تو کون ہے دنیا میں کب ہوگا خدا تیرا

امکاں ہو تیری تیغ کہ لرزاں ہو شاخِ گل
میرے لئے ہیں دونوں تری گل عذاریاں

ان اشعار کی تفہیم رواروی میں نہیں ہوسکتی۔ شاعر کے باطن میں جلتی بجھتی شمع کی لویں جس طرح روشنی اور اندھیرے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، اسی طرح شاعر کا مخصوص و گہرا اشاراتی اسلوب، غزل کے پیچ در پیچ تفہیم کے ایسے موڑ پر لے جاتا ہے جہاں بازار اور اشعار کی خرید فروخت بہ آسانی ممکن نہیں۔ اگر خالد عبادی کے یہاں ایک طرف پرانی اصطلاح حرفِ آرزو ہے تو دوسری طرف تیغ معاش ہے۔ شاخِ گل ہے تو تیغ کی گل عذاریاں بھی۔ ان دونوں کے درمیان گہرے اشارات ہیں۔ معنی کا دھندلکا ہے۔ یہ فطری کم فکری زیادہ نظر آتا ہے جس میں آج کی زندگی کا تضاد و تصادم ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں اشتباہ زیادہ اعتبار کم، جہاں انتشار زیادہ اتحاد کم، اچھی بات یہ ہے کہ شاعر کو علم ہے کہ اس دور میں جو کچھ بھی ہے اس میں ادراک کم، ابہام زیادہ، تازگی کم پیچیدگی زیادہ ہے، غالبًا شاعر نے بھی اسی روش کو اختیار کیا کہ زمانے کے ساتھ بھی ہو اور زمانے سے آگے بھی، تبھی تو غیر شعوری طور پر وہ کہہ جاتا ہے ؂

جو کہہ رہا ہوں اس کو ابھی راز ہی کہو
بھیجا کبھی کسی کو تو شہرہ ہوا رسول

میں کون ہوں کیا بس یہی کہنے کو بچا تھا
دنیا میں کوئی میری طرح کا نہ ہوا تھا

حالانکہ درمیان میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں ؂

لہو میں ڈوبا ہوا آگ میں اُچھالا ہوا
مرے ہی دم سے شب تار میں اُجالا ہوا

مجھے آوارگی بیگانۂ زنجیر رکھتی ہے
مگر یوں ہے کہ زیر پا سر شمشیر رکھتی ہے

شب تار میں اُجالے کا محل صحت مند اشاریہ ہے اور اس بات کا بھی کہ شاعر اور شاعری کا بازاری کرن نہیں ہوا ہے۔ وہ آج بھی بازار اور اشتہار سے الگ ہے، اسی لئے اس کی شاعری بازاری کم دستاویزی زیادہ ہے۔

غزلیں اور بھی ہیں جو چونکاتی ہیں، خاص طور پر اس کی زبان، ردیف قافیے وغیرہ۔ ایک غزل کے قافیہ میں تائید، تسوید، تحدید، توریدوغیرہ ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب نامانوس سے لگتے ہیں۔ یوں تو شاعر کو حق ہے کہ وہ اپنے اسلوب کی اختراع کرے۔ لغت سے ڈھونڈ کر حرف ولفظ کا انتخاب کرے اور اپنے انداز سے غزل کہے کہ شعروادب میں سماج سے بھی بڑی آزادی ہوا کرتی ہے۔ شاید اسی سے انفرادیت ظاہر ہوتی ہے، لیکن میرے ناقص خیال کے مطابق کوئی بھی انفرادیت، اجتماعیت کے ڈھکے چھپے تاثر کے بغیر دور تک سفر نہیں کرسکتی۔ کوئی بھی ''میں'' صرف میں ہی نہیں ہوتا، وہ سینکڑوں ہم سے مل کر بنتا ہے۔ اس کی انفرادیت حقیقتاً ایک کمپوزٹ گراف ہے۔ ہر فرد کے خون میں (شاعر کے خون میں بھی) حرارت میں، دھڑکن میں دوسرں کا خون بھی شامل رہتا ہے۔ شیخ سعدی نے ایک حکایت کے ذریعہ ایک جگہ کہا ہے کہ ایک شاعر کے لئے جو حساس ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے اردگرد سے بے خبر ہوجائے اور لوگوں کو بھول کر صرف اپنی ذات کی فکر کرے۔

لفظیات، تراکیب نئی ہوں تھوڑی بہت تشکیک بھی ہو، لیکن اس حد تک کہ غزل کی ہیئت وروایت اس کی متحمل ہوسکے اور وہ غزل کے

سانچے میں ڈھل سکے۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ انسانیت، اجتماعیت کس نوع کی انفرادیت میں ڈھل رہی ہے۔ جدیدیت کی انفرادیت یا غالبؔ کی انفرادیت۔

خالد عبادیؔ کی اکثر غزلیں فکر سخن اور مشق سخن کے تحت متوجہ کرتی ہیں، لیکن کہیں کہیں شعوری اور اضافی کوششوں کے تحت غیر فطری پن کا شکار بھی ہوتی ہیں۔ جہاں جہاں فکر و اسلوب کا تخلیقی انجذاب ہوگیا ہے وہ غیر معمولی ہوگئی ہیں اور ایسی غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ اعتراف کہ عبادیؔ کی یہ غزلیں ایک نئے رنگ اسلوب اور فکر سخن کا مجموعہ ہیں۔ یہ غزلیں اشتہار والی غزلیں نہیں ہیں، ان میں اجتہاد ہے، ادراک ہے اور حرف و لفظ کا نادر اور قادر اظہار، جس نے ان کو اپنے عہد میں ایک ممتاز و منفرد شاعر بنا دیا۔ میں ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نام کتاب	:	مئو: شہر ہنروراں	
مصنف وناشر	:	ڈاکٹر شکیل احمد	
اشاعت	:	۲۰۲۳ء	
صفحات	:	۳۲۰	قیمت : ۴۰۰روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر رفیق احمد**	

زیر تبصرہ کتاب ''مئو: شہر ہنروراں'' ڈاکٹر شکیل احمد کے تخلیقی سفر کی دوسری منزل ہے۔ شہر دل آرا اور دیارِ فضاؔ مئو ناتھ بھنجن کے علمی و ادبی منظر نامے، تعلیمی و ثقافتی احوال اور سماجی و معاشرتی صورت حال سے واقفیت کے لئے ''مئو: شہر ہنروراں'' نامی کتاب کا مطالعہ جن اصحاب فکر و دانش نے کیا ہوگا، انہیں اندازہ ہوگا کہ واقعی مئو ناتھ بھنجن صرف صنعت و حرفت اور پارچہ بافی کا شہر نہیں ہے، بلکہ اس کی مٹی میں علم و معرفت کے خزانے بھی پوشیدہ ہیں۔ یہاں کے اربابِ فن اور اہل علم نے اپنی محنت پیہم سے اس شہر ہنروراں اور دبستانِ مئو کو علمی و ادبی دنیا تک متعارف کرانے میں شعر و شاعری، ادب و ثقافت اور صنعت و حرفت کے ذریعے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

دیارِ فضاؔ ابن فیضی مئو ناتھ بھنجن کے تعلیمی، سماجی، معاشی و معاشرتی اور ادبی و ثقافتی منظر نامے سے لوگوں کو واقف کرانے کے لئے عصر حاضر کے نامور اہل قلم اور کہنہ مشق ادیب ڈاکٹر شکیل احمد کی کتاب ''مئو: شہر ہنروراں'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مکتبہ الفہیم مئو ناتھ بھنجن نے جون ۲۰۱۲ء میں شائع کیا تھا جس کا انتساب نامور اہل علم و قلم، معروف و مشہور دانشور اور معتبر علمی شخصیت محترم سید حامد صاحب کے نام ہے، آغازِ کتاب میں اردو غزل کے مشہور شاعر محترم فضاؔ ابن فیضی کی ایک نظم ''میرا شہر مرے شہر کے لوگ'' شامل ہے، جس کا ایک بند یہاں درج کیا جارہا ہے ؎

یہاں دکانوں کے شوکیس میں سجتے ہیں ضمیر
سر بازار خرد ، قلب و نظر بکتے ہیں
کاغذی سکوں کی چاندی میں یہ تلتے ہوئے ذہن
آگہی ہوتی ہے نیلام ، ہنر بکتے ہیں
اپنے احساس کی دولت کو بچاؤں کیسے
اب تو انساں بھی سر راہ گزر بکتے ہیں
یہ مرا شہر دل آرا ، یہ مرے شہر کے لوگ
قابل دید مرے شہر کے نظارے ہیں

اب سے نصف صدی قبل محترم فضاؔ ابن فیضی نے اس شہر ہنروراں اور شہر دل آرا کی جو علمی و سماجی منظر کشی کی ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعی اس شہر کے نظارے قابل دید ہیں، مگر افسوس کہ یہاں علم و آگہی اور دانشوری کا موازنہ مال و دولت سے کیا جا تا رہا ہے اور اس دورِ جدید میں بھی اہل علم و قلم کا وقار مجروح ہو رہا ہے اور جو ہر شناس نگاہیں ان کی قدردانی سے چشم پوشی کر رہی ہیں، اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فضاؔ ابن فیضی، ابوظہیر انصاری اور رام اوتار گپتا مضطرؔ نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

دانشور کہلاتے ہیں اب فکر و نظر سے عاری لوگ
اپنے دور کی اس پستی پر چپ ہیں کیوں معیاری لوگ

پھر رہے ہیں سر برہنہ صاحب فکر و نظر
آگہی اور اتنی رسوا آگہی کے شہر میں

بونے ہو جائیں گے اہل علم اپنے شہر میں
دورِ نو میں جاہلوں کا قد بڑا ہو جائے گا

دبستانِ مئو اور دیارِ فضا سے وابستہ ڈاکٹر شکیل احمد کی علمی و ادبی اور سماجی شخصیت اب محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ علمی و ادبی اور سماجی کاموں میں بسر کیا ہے۔ آپ کی تعلیمی و تصنیفی خدمات قابل تحسین ہیں، آپ کی علمی و نمائندہ تحریروں کو سند اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔ آپ کو علمی و ادبی کاموں سے خصوصی دلچسپی ہے جس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک آپ کی مختلف موضوعات پر دس کتابیں شائع ہوکر اہل علم حضرات اور صاحبان قرطاس و قلم سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

(۱) اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء
(۲) مئو: شہر ہنرواراں پہلا ایڈیشن جون ۲۰۱۲ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۲۳ء
(۳) سمٹتا سائبان (خاکے) ۲۰۱۵ء
(۴) بادل چھاؤں (خاکے) ۲۰۱۶ء
(۵) نشاطِ قلم (تنقیدی مضامین) ۲۰۱۶ء
(۶) حسابِ جاں (خودنوشت سوانح) ۲۰۱۸ء
(۷) سفر کی خوشبو (سفرنامہ) ۲۰۲۰ء
(۸) طرازِ قلم (تنقیدی مضامین) ۲۰۲۱ء
(۹) کتاب یاری (تبصرے) ۲۰۲۱ء
(۱۰) مٹھی بھر خطوط (میرے نام) ۲۰۲۳ء

زیر تبصرہ کتاب ''مئو: شہر ہنرواراں'' کا جدید ایڈیشن اس وقت میرے سامنے ہے۔ یہ کتاب اصلاً شہر سخن اور دبستانِ مئو کا علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی، معاشی و معاشرتی اور تعلیمی شہرنامہ ہے جس میں موصوف نے انتہائی مختصر اور جامع انداز میں مئو ناتھ بھنجن کی ادبی و شعری صورتحال، سیاسی و سماجی احوال، تہذیبی و ثقافتی اور معاشرتی منظرنامے کو پیش کیا ہے اور اپنے منفرد اور جداگانہ اسلوب اور طرزِ تحریر میں خاص طور پر اس شہر دل آرا کی تجارتی، علمی، مذہبی، معاشی اور شعری و ادبی سرگرمیوں کا بیان ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، مئو کے پیشہ صنعت و حرفت، تن پوشی اور دست کاری سے وابستہ لوگوں کی قلمی تصویر پیش کرنے میں شکیل صاحب کو قدرت کاملہ حاصل ہے۔

جزئیات نگاری، منظرکشی اور مرقع نگاری میں یہ کتاب رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' کی طرح بے مثال ہے۔ شہر سخن مئو کے گلی کوچوں، رشتے ناتوں، خورد و نوش، موسم و معیشت، دستکاری و ہنرمندی، گردشِ ایام، لباس، بولی اور زبان کے ساتھ ہی ذرائع آمد و رفت، کھیل کود، مختلف ذریعۂ معاش اور رسم و رواج کا بیان جس خوبصورت انداز، دلکش و پرکشش اسلوب میں سلیقے اور ہنرمندی سے مصنف نے کیا ہے اس کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم شکیل صاحب کی کتاب نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان کے شانہ بہ شانہ شہر ہنرواراں مئو کی سیر کر رہے ہیں۔

''مئو: شہر ہنرواراں'' کا یہ نیا ایڈیشن کافی محنت کے بعد منظر عام پر آیا ہے، اس کے لئے مصنف مبارکباد اور خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں، کتاب کا مرکزی موضوع شہر سخن مئو ناتھ بھنجن ہے، موصوف نے اس کی ترتیب سابقہ اشاعت کے طرز پر کی ہے اور کچھ نئے موضوعات کو بھی شامل کتاب کیا ہے۔ ''مئو: شہر ہنرواراں'' کی یہ اشاعت ثانی اس کی عوامی مقبولیت اور شہرت و پذیرائی کی جانب اشارہ کرتی ہے، مصنف نے حذف و اضافہ، ترمیم اور نظرثانی کے بعد کتاب کا نیا ایڈیشن ترتیب دیا ہے، جس کا اسلوب تحریر سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔ مئو کے معاشرے کی بھرپور عکاسی، مرقع نگاری اور منظرکشی میں شکیل صاحب کو بڑی مہارت

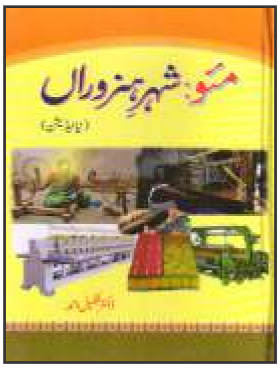

حاصل ہے۔ وہ نہایت فنکاری سے دیارِ فضا، شہر سخن اور شہر ہنرواراں مئو ناتھ بھنجن کی علمی و ادبی صورت حال، سماجی و معاشی سرگرمیوں اور تجارتی و سیاسی احوال و کوائف کا ذکر کرتے ہیں جس کے مطالعہ کے بعد مئو کا پورا تعلیمی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی منظرنامہ ہماری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے۔

دورِ حاضر میں مئو کے اہل علم حضرات کی شعری و ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے بیان اور شعرا و ادبا کے تذکرہ میں شکیل صاحب نے توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا ہے اور نثر نگاروں کے تذکرہ میں کافی

فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے جدید ایڈیشن میں مصنف نے دیارِ فضا و آثر سے وابستہ ۹۸ شعرا ماضی و حال کا مختصر تعارف پیش کیا ہے اور دو دو شعر بطور نمونہ کلام درج کیا ہے۔ علم و ادب، درس و تدریس اور اعلیٰ تعلیمی اداروں سے وابستہ مئو کے اہل علم، ادیب و دانشور، مصنف اور ریسرچ اسکالر حضرات کی طویل فہرست میں سے مصنف نے ایک سو دس نثر نگار حضرات کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا ہے، علمی و دینی اور مذہبی اداروں سے وابستہ علما کرام حضرات نے اس شہر ہنروراں کی تعلیمی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے اس سلسلے میں مصنف نے ۸۸ علما ماضی و حال کا تذکرہ انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں مئوناتھ بھنجن کا جو تاریخی اور جغرافیائی تعارف پیش ہوا ہے وہ مستند و معتبر تاریخی ماخذ اور دستاویزی کتابوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے اس لحاظ سے ''مئو: شہر ہنروراں'' کا جدید ایڈیشن شہر کا بیانیہ اور علمی و ادبی منظر نامہ کے ساتھ ہی تحقیقی نوعیت کی حامل کتاب کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

نام کتاب	:	انتخاب رباعیاتِ عابدہ شیخ		
مصنفہ	:	عابدہ شیخ		
مرتب	:	ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم		
اشاعت	:	۲۰۲۳ء		
صفحات	:	۱۲۴	قیمت :	۵۰۰ روپے
مبصر	:	شرف الھدیٰ		

رواں سال میں اشاعت یافتہ کتاب ''انتخاب رباعیاتِ عابدہ شیخ'' اس وقت برائے مطالعہ و تبصرہ میرے سامنے ہے۔ محترمہ عابدہ شیخ سے ذاتی طور پر میری شناسائی تو نہیں ہے، مگر کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تحریر اور تقریر اور ادبی و شعری تخلیقات اُن کی شخصیت کا حصہ بنتی ہیں۔ ایسے ہی ادبی شخصیتوں میں ایک اہم نام محترمہ عابدہ شیخ کا بھی ہے۔

دنیائے شاعری اور خصوصاً صنف رباعی میں عابدہ شیخ کا نام اور ان کی شخصیت محترم تسلیم کی جاتی ہے۔ آپ برطانیہ کے تاریخی شہر Manchester میں برسوں سے مقیم ہیں۔ عابدہ شیخ (پ ۱۹۴۷ء وزیرآباد، لاہور) کا پہلا شعری مجموعہ ''دل ہی تو ہے'' جنوری ۲۰۲۲ء میں اسلام آباد سے شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''بال و پر'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے اور تیسرا مجموعہ ''ماورا'' کے نام سے اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ عابدہ شیخ کی شاعری کے حوالے سے جناب تنویر پھول رقم طراز ہیں:

> ''عہد حاضر کے معتبر شعرا میں محترمہ عابدہ شیخ کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے، وہ شاعری برائے شاعری نہیں کرتیں بلکہ اپنی خداداد صلاحیت کو کام میں لاکر بنی نوع انسان کی اخلاقی تربیت اور فلاح و بہبود کا راستہ دکھانے کا اہم فریضہ انجام دے رہی ہیں، یہی خصوصیت ان کو ہم عصر شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔''

جرمنی کے شریف اکیڈمی کے صدر جناب شفیق مراد کی رائے بھی ان کی شاعری کے متعلق دیکھئے، وہ لکھتے ہیں:

> ''عابدہ کی شاعری میں بہت سے موضوعات ہیں جو دل کے دروازے پر دستک دیتے ہیں جن پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم کے ذریعہ، مرتبہ عابدہ شیخ کی زیرِ نظر کتاب کا انتساب دو خواتین کے نام ہے۔ اول ڈاکٹر نکہت خانم، سابق صدر شعبۂ اردو، بھاگلپور یونیورسٹی اور دوم ڈاکٹر زینت کیفی، صدر شعبۂ فارسی، ٹی این بی، کالج، بھاگلپور۔ مرتب کتاب ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم نے ہزار سے زیادہ رباعیوں میں سے موصوفہ کی ۳۱۳ رباعیات کا بڑی محنت اور خلوص کے ساتھ انتخاب کر کے شائقین ادب کے سامنے برائے مطالعہ اور برائے استفادہ تحفتاً رکھ دیا ہے۔

یہاں ایک حقیقت کا اظہار کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آج کل کتابیں زیادہ چھپ رہی ہیں وہ افادیت سے بھرپور اور معلومات افزا بھی ہیں پھر بھی طلبا اور قارئین کی تشفی بخش تعداد نسبتاً کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک پہلو ہے اور لمحہ فکریہ بھی۔ وہ بھی رباعی کے صنف میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے والی شاعرات کی تعداد دال میں نمک کے برابر ہے۔ مرتب نے بھی اس طرح کا خیال مذکورہ بالا کتاب میں کیا ہے جن سے راقم بھی اتفاق رکھتا ہے۔ تاہم ایسی صورتحال میں اس کتاب کے مرتب کا حوصلہ لائق ستائش ہی کہا جائے گا۔

زیرِنظر کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عابدہ شیخ نے مختلف موضوعات پرخوبصورت اور بہترین رباعیات کہی ہیں۔زبان خوبصورت، سلیس، شستہ اور بامحاورہ ہے اوران رباعیوں میں فصاحت وروانی کے ساتھ ساتھ وحدت تاثر قابل تحسین ہے جوقاری کوتادیراپنی گرفت میں لئے رہتا ہے۔فن کے لحاظ سے رباعی کا چوتھا مصرع مکمل اور بھرپور ہونا چاہئے، یہ خوبی عابدہ شیخ کی رباعیوں میں ہرجا نظرآتی ہے ۔

قدموں کو بہت چوم رہا ہے دیکھو
گردش میں ہے وہ گھوم رہا ہے دیکھو
آقا نے قدم اپنا جو رکھا اس پر
مستی میں فلک جھوم رہا ہے دیکھو

یہ ایک نعتیہ رباعی ہے جوشاعرہ کےتخیل اور منظرکشی کی خوبصورت مثال پیش کرتی ہے۔اسمائے الٰہی کےعنوان سےمزین پندرہ حمدیہ، اسمائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سےمشرف بہ عنوان چالیس نعتیہ اورمناقب حضرت علی و ابن علی حضرت امام حسین سے آراستہ دس رباعیوں کے بعد اس انتخاب شدہ مجموعے میں عابدہ شیخ کی وہ رباعی سامنے آتی ہے جواُن کا نظریہ شاعری صاف لفظوں میں بیان کردیتی ہے کہ احساس اور جذبہ کامل کے بغیر ''اوزان کا ڈھانچہ تو کھڑا'' ہوسکتا ہے، لیکن شعر، شعر کے قابل نہیں ہوسکتا۔عابدہ شیخ کےلفظوں میں ''محل بنانا آسان ہے، لیکن اشعار کی تخلیق بہت مشکل ہے'' ۔

احساس اگر اس میں نہ شامل ہوتا
اور جذبہ میرا اگر نہ کامل ہوتا
اوزان کا ڈھانچہ تو کھڑا ہو جاتا
پر شعر کہاں شعر کے قابل ہوتا

ملتی نہیں توفیق بہت مشکل ہے
ہر بات کی تصدیق بہت مشکل ہے
آساں ہے محل ایک بنا لینا مگر
اشعار کی تخلیق بہت مشکل ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ زیرِنظر مجموعہ کے مرتب ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم نے

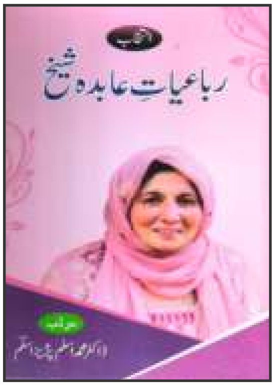

''اردو رباعی کی بےنظیر شاعرہ: عابدہ شیخ'' کےعنوان سے اس کتاب میں اپنا وقیع، جامع، سنجیدہ اور منصفانہ تجزیاتی مضمون شامل کرکے شاعرہ کی زندگی اوراُن کی سخن پروری خصوصاً اُن کی رباعی گوئی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کی تفہیم قارئین کے لئے سہل بنادیا ہے بلکہ رباعیوں کے انتخاب میں بھی اپنی دیدہ وری، جامعیت پسندی اوراپنی ادبی لیاقت کے بہترین ثبوت وشواہد مہیا کردیئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے یک نظر مطالعہ سے ہی عابدہ شیخ کی رباعیوں میں موضوعاتی تنوع کی کیفیت اور اُن کے انداز بیان کی رنگارنگ خوبیاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اُن کی رباعیاں اپنے مضامین کے اعتبار سے بڑوں اور بچوں دونوں ہی کے لئے یکساں فائدہ منداور ذہن کشا ہیں ۔

تقدیر مکر جائے تو پھر کچھ بھی نہیں
تدبیر جو ڈر جائے تو پھر کچھ بھی نہیں
اپنوں ہی سے دنیا میں اپنوں کا بھرم
گھر بار بکھر جائے تو پھر کچھ بھی نہیں

قطرہ نہیں تم خود کو سمندر کر لو
تدبیر سے تقدیر کو بہتر کر لو
دل میں ہے اندھیرا تو ذرا سا اس کو
تعلیم کے دیپک سے منور کر لو

اور پھرخاص طور سے بچوں کے لئے شاعرہ کی یہ نصیحت آمیز رباعی بھی دیکھیں ۔

ساتھی نہ بنو بگڑے ہوئے بچوں کے
صحبت میں ہمیشہ ہی رہو اچھوں کے
تم عابدہ آپی کی نصیحت سن لو!
رب سے ڈرو اور ساتھ رہو سچوں کے

عابدہ شیخ کی رباعیوں میں ناصحانہ دلسوزی ہی نہیں بلکہ ان کے یہاں ہوش ربا

مہنگائی اور افلاس زدہ ملکی معیشت کی تصویر ''ساون کی گھنگھور گھٹاؤں'' کا منظر اور رباعی گوئی کے حوالہ سے اُن کی شاعرانہ خودستائی کا نمونہ بھی بار بار دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے آفاقی واخلاقی حقائق، دینی مضامین، نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن کے اہتمام اور دولت ایمانی کے تحفظ کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ ان کے یہاں تجربات کا بیان بھی ہے، رہبران قوم کا شکوہ بھی اور تقدیر پر اعتماد کا واضح اظہار بھی، ساتھ ہی ساتھ ابنائے زمانہ اور نودولتیوں کی نفسیات پر بھی انہوں نے برجستہ نظر ڈالی ہے۔

رشتہ ہے محبت کا نبھانا مشکل
حاسد کی نظر سے ہے بچانا مشکل
پھولوں سے کوئی بیر نہیں مجھ کو مگر
کانٹوں سے ہے دامن کو چھڑانا مشکل

نہ اہل زمیں یاد رکھے گا ان کو
نہ عرش بریں یاد رکھے گا ان کو
جو صرف یہاں اپنے لئے جیتے ہیں
کوئی بھی نہیں یاد رکھے گا ان کو

برداشت نہیں ہوتی ہے، شہرت ہے نئی
بے قابو ہوا جسم تو طاقت ہے نئی
ہوتا ہے امیروں کا بہت نرم مزاج
لہجہ یہ بتاتا ہے کہ دولت ہے نئی

رہتے ہیں سبھی مکر و ریا کے گھر میں
ہیں قید سبھی ظلم و جفا کے گھر میں
اب کون ملاقات کی خاطر آئے
ہر فرد مقید ہے اَنا کے گھر میں

عابدہ شیخ نے اپنی رباعیوں میں عالمی عصری احوال، رشتوں کے تقدس پر اَنا کے بے پناہ غلبے اور اہل زمانہ کے کردار کی گونا گوں سفا کی ہی نہیں دکھائی ہے بلکہ آج کے دور میں موبائیل کی عادت اور مردوں کے بعض وطیرے پر بھی طنز کے تیر برسادیے ہیں۔

انداز تخاطب میں بھی چالاکی ہے
شوخی ہے لہجہ میں بیباکی ہے
دنیا میں شریفوں کا تو جینا ہے محال
کردار میں ہر شخص کے سفاکی ہے

اخلاق کی خوشبو تو کہیں گروی ہے
دل ہے کہ مروت سے بہت خالی ہے
اپنے ہی خیالوں میں مگن ہے دنیا
رشتوں کے تقدس پہ انا حاوی ہے

ظاہر میں بہت رنگ رنگیلی دنیا
کہتا ہے مگر دل ہے ابھاگی دنیا
مظلوم بہت چیخ رہا ہے ، لیکن
سنتی ہے نہیں کچھ بھی ، ہے بہری دنیا

رکھتے ہیں قریب اس کو بہت اپنے سب
بیوی سے زیادہ ہے اسی سے مطلب
اللہ نے رکھی ہے کشش کچھ ایسی
ہر جیب میں موجود ہے موبائیل اب

گرگٹ کی طرح رنگ نہ چہرہ بدلے
بدلے مگر انسان نہ اتنا بدلے
اس طرح بدلتا ہے وہ بیوی اپنی
جیسے کہ پرانا کوئی کپڑا بدلے

عابدہ شیخ کے یہاں اپنی شخصیت، فطری زنانہ جذبات واحساسات، نسوانی طنطنہ اور تانیثی لب ولہجہ کا واضح اظہار بھی ہوتا رہا ہے۔

تو برف کی مانند یہاں اب مت جم
اللہ نے تجھ کو ہے بنایا آدم
دنیا میں اگر امن تجھے لانا ہے
تلوار نہیں ہاتھ میں رکھ اپنے قلم

تو وصل کے لمحات مجھے مت دینا
پر نور کوئی رات مجھے مت دینا
میں بھیک کسی سے بھی نہیں لیتی ہوں
تو عشق کی خیرات مجھے مت دینا

دریا نہیں ہیں آپ سمندر بھی نہیں
اس عہد کے تو آپ سکندر بھی نہیں
کیوں خود کو سمجھتے ہیں جبل کے حاکم
اے خاک نشیں آپ تو کنکر بھی نہیں

میں ظاہر و باطن کو بدل آئی ہوں
جذبات کی کلیوں کو کچل آئی ہوں
پہلے سے مرا حال بہت اچھا ہے
دنیا کے تفکر سے نکل آئی ہوں

عابدہ شیخ نے اپنی رباعیوں میں نہ صرف خود سے لفظاً خطاب کا طریقہ اپنایا ہے اور ''اے عابدہ! پھیلی ہوئی بدبو ہے یہاں''، ''اے عابدہ! کہتے ہیں یہاں جب بھی غزل'' جیسے مصرعے لایا ہے، بعض ابیات مشہورہ سے صریحاً استفادہ کیا ہے اور ''افکار میں پوشیدہ معانی رکھئے''، ''عجلت میں بڑا کام نہیں ہوتا ہے'' جیسے مصرع چہارم سے مقولہ گوئی کی شان پیدا کی ہے، بلکہ اپنی رباعیوں میں سرتاسر نہایت آسان زبان سے مضبوط اور مفید رشتہ قائم رکھتے ہوئے ادبی تلمیح اور کہاوت و روزمرہ کا استعمال بھی کچھ اس طرح کیا ہے کہ قاری کی نظر اس کی گرفت سے بچ نہیں پاتی ۔

اس ذات کا ہر سمت پتا ملتا ہے
وہ سب سے الگ سب سے جدا ملتا ہے
اے عابدہ بچپن سے یہی سنتی ہوں
ہاں! ڈھونڈنے والوں کو خدا ملتا ہے

خوش ذائقہ ہوتا ہے رسیلا آم
خوشبو ہی نکلتی ہے فقط صبح و شام
غالب نے یہ پوچھا تھا ظفر سے اک دن
کس آم پہ لکھا ہے فقط میرا نام

زیر نظر مجموعہ کے آخر میں بارہ شخصی رباعیات بھی شامل ہیں۔ ممکن ہے کہ جن شخصیتوں پر یہ رباعیاں لکھی گئی ہیں، انہیں ذرا کم کم جاننے کی وجہ سے، مجھ جیسے قاری کے لئے وہ خصوصی دلچسپی کا باعث نہ ہوں، لیکن اتنا ضرور اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاعرہ نے ان رباعیوں میں شخصیات کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے وافر ثبوت مہیا کردیے ہیں۔ محشر فیض آبادی طنز و مزاح کے شاعر ہیں اور ان پر عابدہ شیخ کی اس ظریفانہ رباعی سے آپ بھی مستفید ہوں ۔

بریانی دبانے میں مزا آتا ہے
مرغی کو چبانے میں مزا آتا ہے
ہے اس کی طبیعت میں ظرافت ایسی
محشر کو ہنسانے میں مزا آتا ہے

اسی طرح یہ رباعیاں بھی دیکھئے، ان میں پہلی رباعی ہدایت حسین کے نام اور دوسری ڈاکٹر مظہری کے نام ہے ۔

اشعار کے پازیب کی جھنکار ہیں وہ
گھنگرو سا کھنکنے کو بھی تیار ہیں وہ
اللہ نے دی اُن کو ہدایت ایسی
اردو کی محبت میں گرفتار ہیں وہ

آغاز نہیں صرف ، ہے انجام برا
جو دین کے برعکس ہے وہ کام برا
یہ یاد رہے آپ کو راحت صاحب
بد بھی ہے برا اور ہے بدنام برا

متذکرہ کتاب کا ٹائیٹل پیج خوش رنگ، خوش نما اور دیدہ زیب ہے۔ کتاب بہ اہتمام چھپی ہے، کمپوزنگ اور طباعت عمدہ ہے، کاغذ کی نفاست اور سرورق پر رنگوں کا انتخاب بلاشبہ کشش کا باعث ہے۔ کتاب کو ISBN نمبر بھی حاصل ہے۔ امید ہی نہیں یہ یقین ہے کہ مصنفہ عابدہ شیخ کی رباعیوں کا یہ مجموعہ اپنی گوناگوں خوبیوں سے اہل نظر میں مقبول ہوگا، دادِ تحسین پائے گا اور اس سے خواتین کو رباعی کی صنف میں زیادہ سے زیادہ طبع آزمائی کی ترغیب ملے گی۔ ❁❁

سلام و پیام

☆ ستمبر۲۰۲۳ء کا ''زبان وادب'' پیش نگاہ ہے۔سرورق کے بعد ابتدائی آٹھ صفحات تک کی زیبائش دلکش ودلنواز ہے۔اس کے علاوہ صفحہ۳۷ سے تا آخر، یعنی ''بچوں کا زبان وادب'' بھی رنگین وخوشنما اور قابل دید ہے۔''زبان وادب'' کی یہ خوش رنگ تبدیلی بہت اچھی اور خوش آئند ہے۔تمام قارئین کو شمارے کا دھنک رنگ مبارک ہو۔میں اس کے لئے آپ کو خصوصی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس کی روز افزوں ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔ایسا نہیں کہ یہ شمارہ صرف دولت حسن کا مصداق ہے بلکہ اس کے معیاری مشمولات بھی حسب روایت مطالعہ کے مستحق ہیں۔بیشک ''حرف آغاز'' کی قیمتی سطریں تمام رشحات قلم کی آئینہ دار ہیں اور پھر یہاں ''مقالات'' کے تحت بھی نہایت نفیس علمی تحریریں پڑھنے کو ملیں۔شین مظفر پوری بلاشبہ فکشن کے منجھے ہوئے فنکار تھے۔اُن کے ناولٹ اور افسانے موضوع اور ان کی طرز نگارش کی بدولت آج بھی تر و تازہ ہیں اور اپنی عصری معنویت کا احساس دلاتے ہیں۔اس اعتبار سے ڈاکٹر احمد صغیر نے ان کے افسانوں میں احتجاج کا موثر پہلو خوب خوب نمایاں کر دیا ہے۔بسیار نویسی اور غیر معیاری رسالوں میں اشاعت کی بات الگ رہی، مگر یہ سچائی اپنی جگہ ہے کہ ان کے افسانے آج بھی ذہنوں کو جھنجھوڑ دینے کے لئے کافی ہیں۔''قمر رئیس کی ترجمہ نگاری'' پر ڈاکٹر صابر علی سیوانی کا مقالہ بھی بہت معیاری ہے۔انہوں نے اس مقالہ میں قمر رئیس کے منظوم ترجمہ کا جو نمونہ شامل کیا ہے۔اُسے پڑھ کر واقعی ایسا ہی لگتا ہے کہ ترجمہ نہیں بلکہ ہم کوئی طبع زاد شعری تخلیق پڑھ رہے ہیں۔اس حصہ میں امتیاز احمد دانش کے مقالہ ''عہد غالبؔ میں شہر آرہ کا ادبی وشعری منظر نامہ'' نے بھی تحقیقی مواد کی تلاش اور یکجائی کے لحاظ سے اپنی قدر و قیمت کا احساس دلایا۔اس شمارے کے سبھی مقالے اگرچہ ابھی نہیں پڑھ سکا ہوں، لیکن ان کے عناوین کا تنوع بہر حال ان کے موضوعات کی اہمیت کا واضح اشارہ دے رہا ہے۔ڈاکٹر قمر جہاں کا افسانہ ''ڈوبتا سورج'' بہت ہی بامعنی ہے اور ایک اٹل سچائی کا گواہ۔''منظومات'' کے حصے میں حافظ کرناٹکی کے نعتیہ کلام کا کیا کہنا اور اس میں کیا شک کہ ''چمک گئی دوجہاں کی قسمت نبی کی تشریف آوری سے''اس حصے کی غزلیں،شعری فیلرز اور رباعیاں بھی پسند آئیں۔تاریخ گوئی پر مشتمل کتاب ''ذکر شیخ وشاب'' مصنفہ حولدار سلیم الدین عامرؔ پر محمد شوکت جمال کا تبصرہ واقعی اپنے مبصر کی احتیاط پسندی اور علمی عرق ریزی کا معترف بنا رہا ہے۔''کلام ناصحؔ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رابعہ خاتون نے بھی ناصحؔ ناصری گنجوی کی شاعری کے تجزیے میں محنت سے کام لیا ہے اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی اپنی خوبیوں کا احساس دلا رہا ہے۔اس شمارے کے سبھی مشمولات دعوت قرأت دے رہے ہیں اور اس لحاظ سے تمام قلمکار بھی یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔اللہ کرے حسن سفر اور زیادہ۔

شکیلؔ سہسرامی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب''، ستمبر۲۰۲۳ء نظر نواز ہوا۔رسالہ کھولتے ہی جی خوش ہوگیا۔خدا نظر بد سے بچائے، اس شمارے میں ''رنگینی'' اور سادگی میں پرکاری کا بہت ہی خوب اجتماع ہے۔یہ اہتمام مسلسل برقرار رکھئے، اس حوالے سے آپ کے حسن ذوق کو سلام! شاید نئی آب وتاب کے ساتھ رسالہ منظر عام پر لانا اسی کو کہتے ہیں۔''حرف آغاز'' کا بیان بھی حسب روایت نہایت جامع ہے۔''مقالات'' کے زمرے میں ایک سے بڑھ کر ایک وقیع تحریریں، بحمدہٖ تعالیٰ یہاں جمع ہوگئی ہیں۔''شین مظفر پوری کے افسانوں میں احتجاج'' کی جہتیں اور ان کی فکری و عصری معنویت دکھانے میں ڈاکٹر احمد صغیر بے حد کامیاب نظر آرہے ہیں۔ڈاکٹر صابر علی سیوانی نے بھی ''قمر رئیس کی ترجمہ نگاری'' پر اپنے موضوع کے خصوصی دائرے میں رہتے ہوئے بہت اچھی علمی اور معلوماتی گفتگو کی ہے اور ''ودیا ساگر آنند کی ہائیکو نگاری'' پر ڈاکٹر محمد بشیر الدین کا مقالہ بھی بہت اچھا ہے، البتہ ڈاکٹر محمد شارب ''اکبرؔ کی شاعری کے چند اہم پہلو'' دکھاتے ہوئے، جہاں تک میرا خیال ہے، کچھ زیادہ ضمنی تفصیلوں یں چلے گئے ہیں۔ڈاکٹر وصیہ عرفانہ کے مقالہ میں تبصراتی اور تجزیاتی بیان کی یکجائی بھی پسند آئی ''جدید اردو افسانے میں سماجی وتجزیاتی جہات'' پر انہوں نے بہت متانت اور تسلسل کے

ساتھ اپنی باتیں قائین کے سامنے رکھ دی ہیں۔ اس شمارے میں امتیاز احمد دانش کا مقالہ ''عہد غالبؔ میں شہرآرہ کا ادبی وشعری منظرنامہ'' واقعی ایک تحقیقی مقالہ کہلانے کا حقدار ہے اور اس محنت کے لئے وہ خاص طور سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری'' پر فاطمہ حق کی کاوش بھی حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالیؔ اصلاً نظموں ہی کے شاعر ہیں اور شبانہ عشرتؔ کا مقالہ پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ وہ حالیؔ صاحب کی نظموں میں طلسماتی فضا کا انفراد دکھاتے ہوئے کچھ خاص نکات لانے یا ان کے طرف اشارہ کرنے میں کامیابی سے دور نہیں رہی ہیں۔ نازلہ رباب نے بھی ابواللیث جاوید اور ان کی فکشن نگاری اور شاعری کی یادیں اچھے انداز میں تازہ کردیا ہے۔ ''افسانے'' کے زمرے میں ڈاکٹر قمر جہاں کا ''ڈوبتا سورج'' بہت ہی متاثر کرگیا۔ اس میں کیا شک کہ ایک شرابی کی حالت اُس ڈوبتے سورج ہی جیسی ہوتی ہے جو اپنے ساتھ تاریکی کا پیام لاتا ہے۔ شکیلہ نگار کی کہانی ''سپرنانی'' یوں تو اچھی کہانی ہے اور اپنے اداریہ میں آپ نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے عدم اتفاق کی گنجائش بھی نہیں، بس یہ کہ میرے خیال میں، وہ اسے اگر ایک حد تک ہی طنز ومزاح کی پرچھائیوں میں رکھتیں تو شاید اس کے کلائمکس کا حصہ مزید موثر ہوسکتا تھا۔ عظیم اقبال ہمارے بزرگ قلم کاروں میں ہیں، اُن کا انشائیہ ''تصویر'' بھی لطف سے خالی نہیں۔ ''منظومات'' کے زمرے میں حافظؔ کرناٹکی کی نعت پاک بہت ہی عمدہ ہے، عمران راقمؔ، شہنازؔ فاطمی اور ندیمؔ جعفری کی غزلیں خاص طور سے پسند آئیں، دیگر شعرا وشاعرات کا غزلیہ کلام بھی اچھا ہے۔ نزہت پروین نزہتؔ کی پہلی غزل کا مقطع واقعی گہری رجائیت لئے ہوئے ہے ؎

شکستہ دل نہ ہو رب سے امید رکھ نزہتؔ
یہی امید کوئی معجزہ دکھائے کہیں

شاعری کے اوراق میں صناعات لفظی اور معنوی سے مزین اشعار والے فیلر بہت ہی قیمتی ہیں، اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ واقعی صنائع و بدائع کو شاعری کا زیور محض رسماً نہیں کہا گیا ہے۔ احمد نثارؔ کی ''رباعیات'' بھی خوب ہیں، ان کا اپنا ایک رنگ ہے، انہوں نے اپنی چھٹی رباعی میں ملکہ سبا کے واقعہ کی تلمیح جس طرح پرویا ہے اور مصرع چہارم کو جاندار بنایا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ حولدار سلیم الدین عامرؔ کی کتاب، ذکر شیخ وشباب پر محمد شوکت جمال نے باریک بینی کے ساتھ علمی تبصرہ کا پورا پورا حق ادا کردیا ہے اور ناصحؔ ناصری گنجوی کے مجموعہ ''کلام ناصحؔ'' پر رابعہ خاتون کا تبصرہ بھی نہایت جامع ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' کے مشمولات بھی کسی شکایت کا موقع نہیں دے رہے ہیں۔ اس حصہ کی کہانیاں ہوں یا اس حصہ کے مضامین، اخلاقیات، معلومات اور بچوں کی معصوم نفسیات سے بہرحال اُن کا رشتہ بہت ہی مضبوط ہے۔ اس حصہ کی نظمیں بھی بچوں کو خوب خوب لبھانے والی ہیں۔ خدا کرے بڑوں اور بچوں کے لئے ''زبان وادب'' کا یہ صحافتی سفر اسی طرح آگے بڑھتا رہے۔ آمین!

(ڈاکٹر) شائستہ خاتون، پٹنہ

☆ ستمبر ۲۰۲۳ء کا ''زبان وادب'' ملا، بچوں کا حصہ ''پچھتاوا'' نامی کہانی سے شروع ہوا ہے۔ جناب محمد نجیب پاشا کی یہ کہانی دلچسپ بھی لگی اور نصیحت دینے والی بھی۔ یہاں کلاس ساتھیوں کے بیچ نوک جھونک بڑی ہی مزیدار ہے، مگر اس سے بھی اہم بات بلکہ اصل بات تو وہ ہے جو افضل کے کردار اور اس کی کوشش سے سامنے آتی ہے یعنی وقت پڑنے پر ایک دوست کی مدد کا جذبہ اور ایک کی پکار پر سارے ساتھیوں کا مدد کے لئے تیار ہوجانا اور اپنے اپنے اسکول خرچ جمع کرکے خالد کی مالی مدد کرنا۔ سچ مچ مدد کے جذبے ہی سے تو آدمی کی پہچان ہوتی ہے اور آدمی کسی پچھتاوے سے بھی بچ جاتا ہے۔ اس اخلاقی کہانی کے بعد جناب محمد پرویز اختر کا مضمون ''بدگمانی: ایک اخلاقی بیماری'' پڑھنے کو ملا، یہ بھی ایک بہت اچھا اخلاقی مضمون ہے۔ اس شمارے میں ہمارے لئے ''کامیابی کا نسخہ'' لے کر جناب ذوالفقار بخاری آئے ہیں اور یقیناً ایک چھوٹی سی کہانی کے حوالے سے اُن کا یہ نسخہ تیر بہدف ہے۔ ''کامیابی کی کنجی یقین کامل ہے'' یعنی اللہ پر یقین اور پھر اپنی کوشش اور محنت پر بھروسہ۔ اس بار خیر سے ہی دو شاعروں کی نظمیں پڑھنے کو ملیں، لیکن خوب خوش کرگئیں۔ جناب محمد اسد اللہ کی نظم ''پکنک'' اور ''چڑیا'' بڑا ہی لطف دے جانے والی پیاری پیاری سی نظم ہے اور ''ہمالہ'' کے

عنوان سے ڈاکٹر ذکی طارق نے بھی چھ، چھ مصرع کے پانچ بند میں بہت دلچسپ نظم کا تحفہ ہمیں دیا ہے۔ اس حصہ کا آخری مضمون ''یوم اساتذہ کا پیغام'' بھی اپنے موضوع پر بہت ہی بھرپور ہے، کیونکہ جناب محمد رضوان احمد نے اس میں اساتذہ کا مرتبہ بہت اچھے ڈھنگ سے ہمیں سمجھایا ہے۔ آخر میں ایک بات اور جسے بالکل ہی شروع میں لکھنا چاہئے تھا، وہ یہ کہ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ برسوں بعد پہلے کی طرح پھر رنگین اور دیدہ زیب اوراق سے سجا سجایا ''بچوں کا زبان و ادب'' دیکھنے اور پڑھنے کو ملا ہے۔ ایسے ہی خوبصورت اور رنگین اگلے شمارے کا انتظار رکھتے ہوئے خدا حافظ!

صائمہ پرویز، مظفرپور

☆ ''زبان وادب'' اگست ۲۰۲۳ء کے شمارے سے معلوم ہوا کہ آپ کو بہار اردو اکادمی کے عہدۂ نظامت پر فائز کیا گیا ہے اور ''زبان وادب'' کی ادارتی ذمہ داری بھی آپ کو دی گئی ہے۔ اس پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ امید ہے کہ آپ کی سکریٹری شپ میں اکادمی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگی اور آپ کی ادارت میں ''زبان و ادب'' بہ طریق احسن اپنا علمی و ادبی سفر جاری رکھے گا۔ آمین! زیر نظر شمارے میں آپ نے میری غزل شائع کی ہے، جس کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اس شمارے کے سبھی مشمولات اچھے اور قابل تحسین ہیں، البتہ جناب کلیمؔ سہرامی کی غزل کا یہ مقطع ؎

کلیمؔ اپنی سخاوت کا الگ انداز ہے سب سے
جو وحشت تو اٹھا لائی اور راحت چھوڑ آئی ہے

محل نظر ہے۔ اس کا دوسرا مصرع غیر موزوں ہے۔ کلیمؔ صاحب کی یہ غزل بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔ اس بحر کے ارکان ہر مصرع میں چار بار آتے ہیں، اس طرح ایک شعر میں اس کے ارکان آٹھ بار آتے ہیں۔ اس کے ارکان زیر بحث مصرعے کی تقطیع کے ساتھ ملاحظہ ہوں:

مفاعی لن	مفاعی لن	مفاعی لن	مفاعی لن
ج وحشت تو	اُٹھالائی	اور راحت چھو	ڑ آئی ہے

ان ارکان کے تیسرے رکن میں اور کے ''واؤ'' اور ''رے'' ساقط الوزن ہیں۔ اور کا ''واؤ'' تقطیع میں گرایا جاسکتا ہے، لیکن ''رے'' کا گرانا درست نہیں اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ اور کا ''واؤ'' بھی نہ گرایا جائے۔ مشہور ماہر عروض ولسانیات خواجہ محمد عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی مرحوم نے درج ذیل مصرعے:

چار دن اٹھالے اور جو جفا اٹھانی ہو

کی تقطیع میں لکھا ہے کہ ''اور'' کو شاعر نے ار نظم کیا ہے یعنی ''واؤ'' کو تقطیع میں نہیں لیا ہے، ایسا جائز ہے، لیکن قابل ترک ہے اور بعض احتیاط کرتے ہیں۔ (شاعری کی دوسری کتاب، ص ۱۷) علاوہ ازیں زیر بحث مصرعے میں حرف عطف اور کی ''رے'' اور لفظ راحت کی ''رے'' کے اتصال سے تنافر حروف کا عیب در آیا ہے۔ زیر بحث مقطع میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو سخاوت انسان میں افلاس پیدا کر کے اس کو وحشت سرائے بیاباں میں پہنچادے، وہ سخاوت نہیں اسراف و تبذیر ہے جو بہ ہر طور مذموم ہے، قرآن حکیم میں صراحت کے ساتھ اسراف وتبذیر کی مذمت کی گئی ہے۔ بہرحال کلیمؔ سہرامی صاحب کی غزل خوبصورت ہے، لیکن مقطع کے شعر پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

وارثؔ ریاضی، مغربی چمپارن

☆ ماہنامہ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۲۳ء ایک دوست کے توسط سے ملا اور بصیرت افروز ہوا۔ پہلی بار اس رسالہ کے دیدار ہوئے ہیں۔ مسرت ہوئی کہ بہار اردو اکادمی، پٹنہ اس قدر دلکش اور معیاری جریدہ ہر ماہ شائع کر رہی ہے۔ اس رسالے میں غزلوں کا معیار بھی عمدہ ہے۔ محترمہ سائرہ عظیم، دہلی کی دونوں غزلیں پسند خاطر ہوئیں۔

زویا شاہین، علی گڑھ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	میں بھی سوچوں تو بھی سوچ	محمود اختر جلالپوری	۷۴
☆	جب میں نے میزائیل مین کو دیکھا	عائشہ رفعت	۷۵
☆	سچ کہنے کی عادت ڈالو	خالد رحیم	۷۶
☆	بینک کی باتیں	امتیاز احمد انصاری	۷۷
☆	لال بہادر شاستری	درخشاں جبیں	۷۸
☆	......کنبہ ڈوبا کیوں؟	عامر حسن	۸۰

❁❁❁

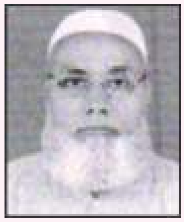

محمود اختر جلالپوری
Qazipura, Jalalpur, Ambedkar Nagar - 224149 (Mob. 9506316688)

میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

علم ہے کیسے حاصل کرنا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
کیسے ہے ہم کو قابل بننا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

چلو چلو اسکول چلیں ہم　　پڑھنے کا اب جتن کریں ہم
نہیں ہے ہم کو جاہل رہنا　　میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
علم ہے کیسے حاصل کرنا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

آؤ مل کر فکر کریں ہم　　پڑھنے کا اب ذکر کریں ہم
کیسے ہے ہم کو آگے بڑھنا　　میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
علم ہے کیسے حاصل کرنا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

محنت سے ہم خوب پڑھیں گے　　دیش کا اونچا نام کریں گے
پڑھ لکھ کر افسر ہے بننا　　میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
علم ہے کیسے حاصل کرنا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

کھیتوں میں ہریالی آئے　　چہروں پہ خوش حالی آئے
کیسے اُس جانب ہے بڑھنا　　میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
علم ہے کیسے حاصل کرنا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

جھوٹ سے اب ہم دور رہیں گے　　سچائی کی راہ چلیں گے
سارے جگ میں نام ہے کرنا　　میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
علم ہے کیسے حاصل کرنا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

یا رب اپنی رحمت کر دے　　علم کی خوبی دل میں بھر دے
اختر کا بس یہی ہے کہنا　　میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
علم ہے کیسے حاصل کرنا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

عائشہ رفعت
Alamganj Ghera, Patna - 800007

جب میں نے میزائیل مین کو دیکھا

بات ان دنوں کی ہے جب میں پانچ، چھ برس کی تھی اور پٹنہ کے عالم گنج میں رہتی تھی۔

’’میزائیل مین کو دیکھنے چلوگی......؟‘‘ گھر کے بڑوں نے کہا اور ساتھ لے کر سڑک پر آ گئے۔ سڑک کے دونوں طرف بانس بلا بندھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا، گاڑیوں کا قافلہ آ رہا ہے۔ ایک بڑی سی کار پر ایک آدمی بیٹھے تھے اور ہم بچوں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے، ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ہم بچے بھی مگن تھے۔ گاڑی کچھ دھیرے دھیرے ہی گئی تھی۔

’’میں ابھی اور دیکھوں گی۔‘‘

میں نے کہا اور پھر میں سڑک کے دوسرے کنارے پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ان کی گاڑی گزری، وہی مسکراہٹ، وہی ہاتھ ہلاتے ہوئے...... ہم بچوں نے بھی ’’ٹاٹا‘‘ کیا۔ اس طرح مجھے میزائیل مین کو بہت نزدیک سے دوبارہ دیکھنے کا موقع ملا۔

یہ قصہ اس سفر کا ہے جب میزائیل مین، صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام شاید آخری بار پٹنہ آئے تھے اور سکھوں کے شری گرو گوبند سنگھ گردوارہ جانے کے دوران اشوک راج پتھ سے گزر رہے تھے۔ اُس وقت تو اپنی عمر کے حساب سے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی، پھر بڑی ہونے پر اسکول آتے جاتے، بڑوں سے سنتے سناتے اور کتابوں میں پڑھتے پڑھاتے بہت کچھ جانکاری ہوتی گئی، معلوم ہو گیا کہ اے۔ پی۔ جے اصل میں ابوالفاخر زین العابدین کا انگریزی مخفف ہے۔ میں ابوالکلام سمجھ رہی تھی۔ ایک استاد نے دھیان دلایا کہ ابوالکلام نہیں عبدالکلام نام ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۵؍اکتوبر ۱۹۳۱ء اور جائے پیدائش تامل ناڈو کا علاقہ دھنش کوڈی ہے۔

میں نے کتابوں میں اُن کے حالات ڈھونڈ نکالے، یہ میرے اسکولی دور کی بات ہے۔ ان کے بارے میں مضامین اور کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ بچپن ہی سے پڑھائی کے بڑے شوقین تھے۔ راماناتھ پورم کے ایک مشنری اسکول سے ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے تروچی کے جاسف کالج سے انٹر کیا اور پھر انجینئرنگ کی پڑھائی کے لئے مدراس چلے گئے۔

پیارے بچو! اے پی جے عبدالکلام ماہی گیر غریب گھرانے کے آدمی تھے، ان کے پاس پیسہ نہیں، مگر لگن اور محنت تھی، وہ اخبار کے ہاکر کا کام کر کے پڑھائی کا خرچ نکالتے تھے۔ ان کی لگن اور ان کا شوق دیکھ کر ان کی بہن نے اپنا کنگن بیچ کر انہیں پڑھائی کا خرچ دیا تھا۔ اے پی جے عبدالکلام شروع ہی سے خلائی سائنسی تحقیق میں دلچسپی رکھتے تھے، یہاں تک کہ ان کی دلچسپی اور محنت انہیں اس مقام پر لے آئی کہ وہ میزائیل مین کہلائے۔ انہوں نے پرتھوی، اگنی، ترشول، ناگ اور آکاش نامی میزائیلوں کے کامیاب تجربے کئے۔ ہاں ایک بات اور مزے کی یاد آئی۔ اسکول میں ایک ٹیچر نے بتایا تھا:

’’جانتی ہو! ان میزائیلوں کے نام کا پہلا حرف لے لیں تو 'PATNA' بن جاتا ہے۔‘‘

میں نے میزائیل مین کو پٹنہ ہی میں تو دیکھا تھا۔ مجھے یہ جان کر اور خاص طرح کی خوشی ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالکلام کی زندگی اور کامیابی کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ ’’میزائیل مین‘‘ کا اور دوسرا ’’صدر جمہوریہ ہند‘‘ کا۔ ۲۵ جولائی ۲۰۰۲ء سے ۲۵ جولائی ۲۰۰۷ء تک وہ اس جلیل القدر عہدے پر فائز رہے اور ملک و قوم کی بڑی بڑی

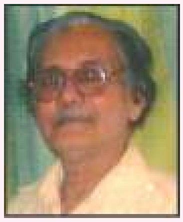

خالد رحیم
Khansama Lane, Manisahu Chowk, Buxi Bazar, Cuttack - 753001(Mob. 9861976587)

سچ کہنے کی عادت ڈالو

غور سے میری بات سنو تم
نیک بنو اچھے کہلاؤ
جھوٹ مصیبت ، جھوٹ اذیت
سچائی کا ساتھ نبھاؤ
سچے کو ملتی ہے عزت
سچ سے ہے مضبوط ارادہ
سچ سے سر اونچا رہتا ہے
جو سچ بولے جنت پائے
سچ کہنے کی عادت ڈالو

اور ہمیشہ یاد رکھو تم
سچ بولو سچے کہلاؤ
لیکن دے سچائی راحت
ہرگز جھوٹ کے پاس نہ جاؤ
جھوٹوں کے حصے میں ذلت
سچ کرتا ہے پورا وعدہ
جھوٹا شرمندہ ہوتا ہے
جھوٹ جہنم تک لے جائے
رب کی خوشنودی اپنا لو

❀❀❀

خدمتیں انجام دیں۔ اے پی جے عبدالکلام اصل میں ایک استاد تھے، پڑھنے پڑھانے سے ایسی محبت رکھنے والے کہ زندگی کے آخری لمحہ تک پڑھاتے رہے۔ انہیں نوجوانوں اور بچوں سے اتھاہ پیار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کا کوئی بچہ اَن پڑھ نہ رہے، خوب پڑھے، اس کے اندر ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ جاگتا رہے، اس کے پاس اونچے خواب ہوں اور اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے وہ جی جان سے محنت اور پڑھائی کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ جس دن آپ کے دستخط آٹوگراف میں بدل جائیں تو سمجھ جائیں کہ آپ کامیاب ہوگئے ہیں۔

اے پی جے عبدالکلام نے اپنی کتابوں میں بھی یہی پیغام دیا ہے اور اپنی شاعری سے بھی یہی پیغام ہم تک پہنچایا ہے۔ ان کی باتیں زندگی کو زمانے کے مطابق سنوارنے والی باتیں ہیں۔ ان کی خود نوشت ''وینگس آف فائر''جس کا اردو ترجمہ ''پرواز'' کے نام سے ہے، اس میں ان کے تقریری بیانات میں ہمارے لئے نصیحتوں کے ایک سے ایک قیمتی چمکتے دمکتے موتی موجود ہیں اور ہماری بڑی خوش قسمتی یہی ہوگی کہ ہم ہمیشہ ان موتیوں سے اپنے دامن بھرتے رہیں۔

اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش یعنی ۱۵/اکتوبر کو عالمی یوم اساتذہ منایا جاتا ہے۔ ۲۷/جولائی ۲۰۱۵ء کو شیلانگ (میگھالیہ) میں اپنے طلبا کو لکچر دیتے ہوئے اچانک ان کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ جسمانی طور پر ہمارے میزائیل مین اب ہمارے درمیان نہیں، مگر ان کی باتوں کا سایہ ہمارے سروں پر ہے اور مجھے آج بھی خوشی ہے کہ میں نے انہیں ایک بار نہیں، دوبار دیکھا ہے۔

❀❀❀

امتیاز احمد انصاری
H/No. 24, Railpar, Jahangiri Mohalla, Asansol 713302 (W.B) (Mob. 09749289061)

بینک کی باتیں

پیارے بچو! آپ نے بینک کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ آپ میں سے بہت سارے بچوں نے بینک کے اندر داخل ہوکر وہاں کا نظارہ بھی کیا ہوگا۔ یوں تو اس ترقی یافتہ دور میں کئی طرح کے بینک وجود میں آ چکے ہیں جیسے بلڈ بینک، بک بینک اور فوڈ بینک وغیرہ وغیرہ، مگر عام طور پر جس بینک کا نام آتے ہی ذہن میں ڈھیر سارے روپیوں کا تصور ابھرنے لگتا ہے، آیئے آج ہم اسی بینک کی باتیں کرتے ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بینک وہ جگہ ہے جہاں روپیوں کا لین دین ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بینک روپیہ جمع کرنے والوں، روپیہ نکالنے والوں اور قرض داروں کے درمیان ایک کڑی کا کام کرتا ہے۔ بینک کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ وہ مالی ادارہ ہے جہاں عوام سے روپیوں کو قبول کرنے اور جمع شدہ رقم کی آسان واپسی کا انتظام کرنے کے علاوہ ایک خاص شرح سود پر قرض کی سہولت کی فراہمی، روپیوں کی ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقلی اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ساتھ بھاری رقموں اور قیمتی اشیا کو حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لئے لاکر کی خدمات پیش کی جاتی ہیں۔

بینک کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ دنیا کا سب سے پہلا بینک "Medici Bank" اٹلی میں ۱۳۹۷ء میں Giovannidi Bicci de' Medici نامی شخص نے قائم کیا تھا۔ ہندوستان میں ۱۷۷۰ء میں "Maidavolu Nara Simham" نے کولکاتہ میں بینک آف ہندوستان کے نام سے پہلا بینک قائم کیا تھا۔ اسی بنیاد پر انہیں Father of Bank بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں چار طرح کے بینک ہیں۔

(۱) سنٹرل بینک　(۲) کمرشیل بینک
(۳) کواپریٹیو بینک　(۴) ریجنل رورل بینک

بینکوں کی تعداد کی بات کی جائے تو اس وقت ملک میں کل ۳۴ نیشنل بینک ہیں جن میں ۱۲ گورنمنٹ بینک اور ۲۲ پرائیوٹ سیکٹر بینک ہیں۔ ان بینکوں میں سب سے اہم RBI یعنی Reserve Bank of India ہے جو ملک کا سنٹرل بینک ہے۔ اس کا قیام یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو کولکاتہ میں عمل میں آیا۔ یہ ہندوستانی بینکنگ نظام کو چلانے کا ذمہ دار ہے، اسی لئے اسے Banker's Bank یا Mother's Bank بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ملک کی مالیاتی پالیسی کو قابو کرنے والا ادارہ ہے جو ہندوستانی کرنسی جاری کرنے اور اس کی فراہمی کو کنٹرول میں رکھنے کے ساتھ ملک کی مالی حالت کو مستحکم کرنے میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔

واضح ہو کہ پرائیوٹ سیکٹر بینکوں میں فی الحال HDFC یعنی (Housing Development & Finance Corporation limited) کو سب سے بہتر بینک مانا جا رہا ہے جس کی بنیاد ۱۹۹۴ء میں ڈالی گئی تھی۔ ۱۹ نومبر ۲۰۱۳ء میں ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے یوم پیدائش کے موقع پر ممبئی میں Bhartia Mahila Bank کے نام سے ملک کی خواتین کے پہلا بینک کی شروعات ہوئی تھی جس کا افتتاح ملک کے اس وقت کے وزیر اعظم من موہن سنگھ نے کیا تھا۔ اس بینک کی یہی خوبی ہے کہ اس بینک کی تمام ملازمین خواتین ہیں۔

بدلتے ہوئے وقت اور زمانے کی ترقی کے ساتھ بینک کے کام کاج اور طریقہ کار میں بھی کافی ترقی آئی ہے۔ کبھی بینکوں میں صرف روپے جمع کرنے اور نکالنے کا کام ہوا کرتا تھا مگر Cashless Payment کا رواج عام ہوگیا ہے۔ اس کے ذریعہ نہ صرف اپنے اکاؤنٹ سے روپے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کئے جاسکتے ہیں بلکہ چھوٹی بڑی اشیا کی آن لائن خریداری بھی کی جارہی ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ اگر آپ کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے تو پھر بینک کے اوقات میں بینک

(بقیہ ص ۷۹ پر)

درخشاں جبیں

Alamganj, Patna - 800007

لال بہادر شاستری

پیارے بچو! اکتوبر کا مہینہ آتا ہے تو ہمارے دو عظیم رہنماؤں کی یاد خود بخود تازہ ہونے لگتی ہے، خاص طور سے اس لئے بھی کہ دونوں کی پیدائش کی تاریخ ایک ہی ہے یعنی ۲/اکتوبر ـــــ اسی تاریخ کو باپو کہلانے والے مہاتما گاندھی بھی پیدا ہوئے تھے اور اسی تاریخ کو لال بہادر شاستری جی بھی، جو آزاد ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم بنے۔ البتہ ان دونوں کے سال ولادت میں پورے ۳۵ سال کا فاصلہ ہے۔ یعنی ۱۸۶۹ء میں پیدا ہونے والے موہن داس کرم چند گاندھی ۱۹۰۳ء میں جب اپنے قائم کردہ ٹرانسوال فارم اسکول میں بچوں کو تعلیم دے رہے تھے تو اسی زمانے میں ۱۹۰۴ء میں، مغل سرائے میں ایک اسکول مدرس شری شاردا پرشاد کے گھر ایک بچے کی پیدائش ہوئی، یہی بچہ لال بہادر شاستری کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔ شاستری جی کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ جب وہ ڈیڑھ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا تب ان کی والدہ انہیں لے کر پانے مائیکہ چلی گئیں اور ان کے ماموں شری رگھوناتھ پرشاد نے ان کی پرورش کا ذمہ سنبھالا۔

شاستری جی کا بچپن بہت غربت میں گزرا۔ ان کے بچپن کے کئی قصے بہت مشہور اور سبق آموز ہیں۔ جب وہ تین ماہ کے تھے تو ایک بار گنگا گھاٹ پر وہ غائب ہو گئے اور ایک چرواہے کو مل گئے۔ اسے کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ انہیں پا کر بہت خوش ہوا اور اس نے بہت جشن منایا، مگر ان کی والدہ بہت افسردہ تھیں، پھر پولس میں معاملہ درج کرایا گیا۔ آخر وہ مل گئے اور پھر انہیں ان کی ماں کے پاس واپس پہنچا دیا گیا۔

شاستری جی بچپن سے بہت ہی خوددار تھے۔ ایک بار وہ بچوں کے ساتھ گنگا پار میلہ دیکھنے چلے گئے۔ واپسی میں ان کے پاس ناؤ کا کھیوا دینے کا پیسہ نہیں تھا۔ ان کی خودداری کو یہ گوارہ نہیں ہوا کہ دوستوں سے پیسہ لیں، لہٰذا وہ دوستوں سے الگ ہو کر چھپ گئے۔ جب سارے لڑکے ناؤ پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے تو شاستری جی گنگا ندی میں کود پڑے اور تیر کر ندی پار کیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے کہ شاستری جی کو گنگا پار کر کے اسکول جانا پڑتا تھا، ایک بار ان کے پاس کرایہ کا پیسہ نہیں تھا تو انہوں نے اسکول ناغہ نہیں کیا بلکہ اپنی کتابیں اپنے سر پر رکھ لیا اور تیر کر اُس پار گئے۔ یہ تھی پڑھائی سے ان کی محبت۔

ان کے بچپن کا ایک اور مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار وہ لڑکوں کے ساتھ آموں کے باغ میں پہنچ گئے۔ کچھ لڑکے پیڑ پر چڑھ کر آم توڑنے لگے۔ شاستری جی نیچے کھڑے تھے کہ اتنے میں مالی آ گیا اور اس نے انہیں پکڑ لیا اور سرزنش کرنے لگا۔ انہوں نے مالی کو بتایا کہ ”وہ یتیم ہیں“، تو مالی نے کہا کہ ”تم یتیم ہو اس لئے تمہارا کردار تو اور اچھا ہونا چاہیے۔“ انہوں نے مالی کی بات گرہ باندھ لی اور ساری زندگی اس پر عمل پیرا رہے۔ شاستری جی کی سادگی، ایمانداری اور خودداری کے ساتھ ان کی دلیری کا سبھی لوہا مانتے ہیں۔

۱۹۱۵ء کی بات ہے جب گاندھی جی بنارس ہندو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے وارانسی آئے تھے، اس وقت شاستری جی گیارہ برس کے تھے اور اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کا نام سنا اور ان کی باتوں اور کاموں کے ذکر سے اُن کا ذہن متاثر ہونے لگا، یہاں تک کہ گاندھی جی نے جب ۱۹۲۱ء میں چل رہی عدم تعاون تحریک کے دوران کالجوں، اسکولوں کو چھوڑنے کی بات کہی تو اس وقت شاستری جی اپنا انٹرنس کا

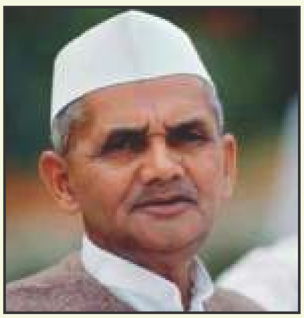

امتحان چھوڑ کر آزادی کی تحریک میں پورے جوش وخروش سے لگ گئے۔ وہ سات مرتبہ آزادی کی تحریک میں شامل ہوئے اور کل ملا کر نو سال قید کاٹی۔

شاستری جی بہر حال پڑھائی کے دیوانے تھے، چنانچہ انہوں نے موقع ملتے ہی ۱۹۲۵ء میں وارانسی کے کاشی ودیا پیٹھ کالج سے فلسفہ میں شاستری (گریجویٹ) کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد لوگ ان کے نام کے ساتھ شاستری کا لاحقہ جوڑنے لگے۔ شاستری جی کے اساتذہ میں مشہور مفکر اور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کا نام شامل ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ان کی شادی للیتا دیوی سے ہوگئی جو ایک مہذب اور فرمانبردار بیوی ثابت ہوئیں اور ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا۔

اسی زمانے کے آس پاس کی بات ہے کہ شاستری جی لالہ لاجپت رائے کی ''انجمن خدام ہند'' کے کارکن ہی نہیں بنے بلکہ تاحیات اپنی تنخواہ سے اس انجمن کو ڈھائی سو روپے ماہانہ چندہ بھی دیتے رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے شاستری جی کا رابطہ اسی زمانے میں ہوا تھا۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء میں لال بہادر شاستری یوپی کابینہ کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ریلوے کے وزیر بنے، مگر بدقسمتی سے اسی دور میں جنوبی ہند میں ایک ریل حادثہ ہوگیا جس میں سو سے زیادہ جانیں چلی گئیں، انہوں نے اس حادثہ کے بعد یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ:

''میں اس ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہوسکتا۔''

یہ تھا شاستری جی کا احساس ذمہ داری اور ان کی سوچ کا اخلاقی درجہ۔

لال بہادر شاستری ہندی کے علاوہ اردو میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہیں اردو لکھنا اور پڑھنا بہت پسند تھا۔ انہوں نے اپنے شوق سے اردو کے سیکڑوں اشعار یاد کرلیا تھا، جن کو وہ اپنی تقریروں میں اکثر دہرایا کرتے تھے۔ وہ اکثر خالی اوقات میں شعر بھی سنا اور سنایا کرتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے کے اردو اخبار ''بندے ماترم'' میں انہوں نے نامہ نگار کی حیثیت سے کچھ دنوں تک کام بھی کیا۔ شاستری جی زبان کے معاملے میں ہمیشہ ایک دوسرے کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے سے بچنے کی بات کیا کرتے تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی رحلت کے بعد لال بہادر شاستری ۹ جون ۱۹۶۴ء کو ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم بنے۔ ان کے وزیر اعظم کے عہدے پر رہتے ہوئے ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے بیچ جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں شاستری جی نے ''جے جوان جے کسان'' کا نعرہ دیا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ کھیتوں میں کسانوں کا فصل اُگانا اور ملک کی خدمت کے لئے میدانوں میں فوجوں کا جنگ کرنا دونوں برابر ہے۔

لال بہادر شاستری ۵/جنوری ۱۹۶۶ء کو پاکستان سے سمجھوتہ کرنے تاشقند گئے۔ وہاں پاکستان کے صدر ایوب خان اور شاستری جی کے درمیان جنگ بندی کے لئے دستخط ہوئے، مگر آگے کی خبر کس کو تھی۔ اس سمجھوتہ کے چند گھنٹے بعد ہی یعنی ۱۱/جنوری ۱۹۶۶ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے شاستری جی کا انتقال ہوگیا۔

شاستری جی ایک سچے ہندوستانی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہندوستان کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔ وہ خلوص کے ساتھ اپنا فرض انجام دینے والے ایسے آدمی تھے جس کو گیتا کی زبان میں ''کرم یوگی'' کہا جاسکتا ہے۔ وہ وقت اور حالات کے مطابق ہیرے سے زیادہ سخت اور پھولوں سے زیادہ نرم بن جانے والے انسان تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کی تعلیم سے سبق لیا اور پنڈت جی کی تربیت سے اپنے آپ کو ملک وقوم کی بہترین خدمت کے قابل ہی نہیں بنایا، بلکہ اس کے ثبوت بھی دے گئے۔ حصول تعلیم کے لئے لگن کے واقعات، بچوں کے لئے ان کے سب سے اہم اسباق کا درجہ رکھتے ہیں۔

بینک کی باتیں (ص ۷۷ سے آگے)

جا کر روپے نکالنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑتی ہے بلکہ چوبیس گھنٹے بینک سے باہر ATM سے روپے نکالے جاسکتے ہیں۔ بینک کے سلسلے سے ان معلومات کے بعد آیئے بینک کے نظام میں استعمال ہونے چند مخففات کا پورا نام بھی جان لیں:

ATM	:	Automated Teller Machine
PIN	:	Personal Identification Number
IFSC	:	Indian Financial System Code
NEFT	:	National Electronic Fund Transfer
RTGS	:	Real Time Gross Settlement
MICR	:	Magnetic Ink Character Recognition

عامر حسن
Baria, Muzaffarpur (Bihar)

......کنبہ ڈوبا کیوں؟

پیارے بچو! بڑوں نے کہا ہے ''کم پڑھ سے اَن پڑھ اچھا'' اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آدمی اَن پڑھ رہے، بلکہ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ تھوڑا علم ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ یہ بات ایک دوسرے انداز سے بھی سکھائی گئی ہے کہ ''ایک من علم کے لئے نو من عقل چاہیے''، یعنی کسی بات کی جانکاری ہو، مگر اُسے برتنے میں سمجھداری سے کام نہ لیا جائے تو ایسی جانکاری بہت ہی خطرناک بن جاتی ہے۔ شاید تم نے کبھی یہ کہاوت سنی ہو کہ:

''حساب جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں''

یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی آدمی تھوڑا سا پڑھ لکھ کر اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھنے لگتا ہے اور اُسی کے مطابق خود بھی عمل کرنے بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بہکانے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود بھی پریشانی اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشانی میں ڈال دیتا ہے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ کہاوتیں صرف خیالی نہیں ہوتی ہیں، بلکہ کہاوتوں کے پیچھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کہانی چھپی رہتی ہے۔ جب زندگی میں کوئی خاص تجربہ ملتا ہے تب ہی وہ آگے چل کر کہاوت میں ڈھلتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک لڑکا حساب بنانے کے قاعدے سیکھا کرتا تھا۔ ایک دن اُستاد نے اُسے اوسط نکالنے کا قاعدہ بتایا۔ وہ لڑکا ذہین تھا۔ اس نے وہ قاعدہ رَٹ لیا۔ اتفاق کی بات کہ وہ گھر آیا تو گھر کے لوگ کسی ضرورت سے ندی پار جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے اور بس اُس کے آنے ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ سب ندی کے کنارے پہنچے تو اُس لڑکے نے کشتی والوں سے معلوم کر لیا کہ ندی کناروں سے دو فٹ گہری ہے اور بیچ میں آٹھ فٹ۔ اوسط نکالنے کا فارمولا ابھی اُسے تازہ تازہ ہی ملا تھا، اُس نے حساب لگانے میں دیر نہیں کی یعنی دو اور دو چار فٹ، پھر آٹھ فٹ کل ملا کر بارہ فٹ۔ اس نے بارہ فٹ کو تین سے تقسیم کر دیا اور جواب ملتے دیر نہیں لگی یعنی ندی کی اوسط گہرائی چار فٹ۔

وہ لڑکا ذرا جذباتی اور ضدی بھی تھا۔ اس نے خوشی خوشی سبھوں کو بتایا کہ: ''میں نے حساب لگا کر دیکھ لیا ہے، اس ندی کی اوسط گہرائی چار فٹ ہے۔ کشتی کا کھیوا بچے گا۔ بغیر کشتی کے ندی کو آسانی سے پار کیا جا سکتا ہے۔''

بڑوں کو تھوڑی سی ہچکچاہٹ ہوئی، مگر اس کی ضد کے آگے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے اپنے سامان سمیت وہ سب ندی میں اتر گئے، مگر جب وہ ندی کے بیچ میں پہنچے تو آٹھ فٹ گہرے پانی میں ڈوبنے لگے۔ بڑی مشکل سے آس پاس موجود ملاحوں نے انہیں بچایا۔

اُس لڑکے نے دوسرے دن پھر حساب جوڑا، حساب بالکل ٹھیک تھا۔ اب اس نے خود اپنے آپ سے سوال کیا، وہی سوال جو کہاوت میں ہے کہ:

''حساب جوں کا توں، پھر کنبہ ڈوبا کیوں؟''

اس کا جواب یہی تھا کہ اس نے تھوڑا جان کر اسے بہت کچھ جاننا سمجھ لیا تھا اور علم سے کام لینے کے لئے عقل کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ عقل کا دامن پکڑتا تو وہ اسے ضرور بتا دیتی کہ ندی کو بہر حال اوسط گہرائی سے نہیں بلکہ پوری گہرائی سے پار کرنا تھا اور پوری گہرائی میں ڈباؤ پانی تھا جو جان و مال کے لئے خطرہ بنتے بنتے بچا۔ اگر ملاح قریب میں نہ ہوتے تو تھوڑے سے علم پر عمل کی بیوقوفی پورے کنبہ کی ہلاکت میں بدل جاتی، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پوری بات جان لیں۔ اچھی طرح سمجھ لیں، سیکھ لیں اور سوچ لیں تب کوئی قدم اٹھائیں، ورنہ کم پڑھ کا مشورہ ہمیں مصیبت میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2023

Volume : 44 | **October - 2023** | **No. 10**

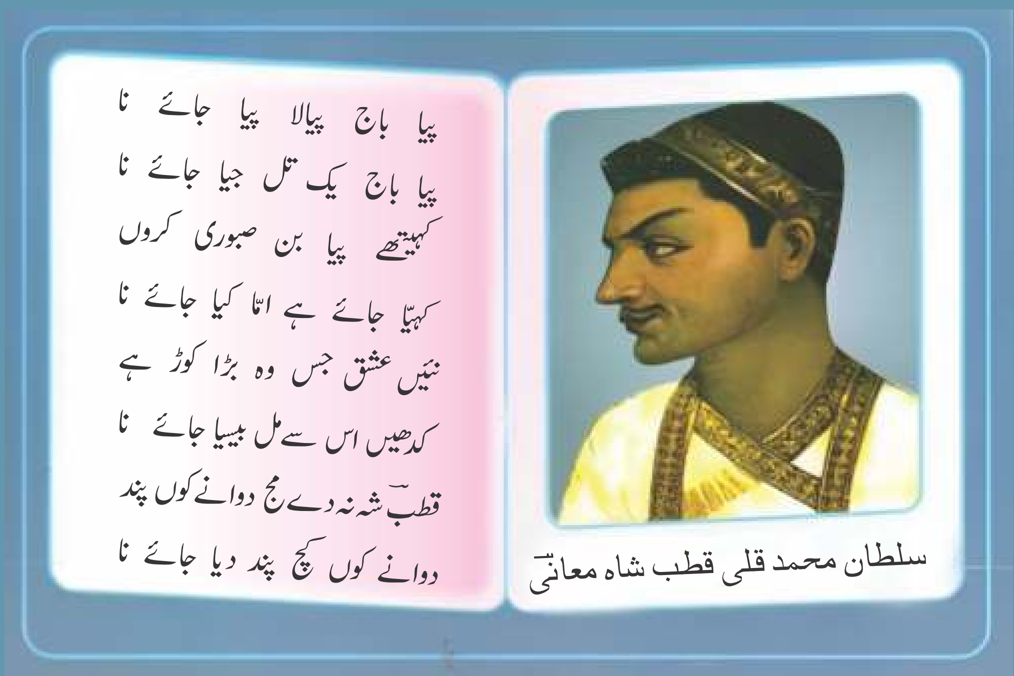

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy,
on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press
Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15